دیوان قربی - مرتبہ پروفیسر سید فضل اللہ صاحب، صفحات ۹۸، کتابت وطباعت متوسط، ناشر جناب عدنی، جناب منزل (گاندھی نگر) نرونچی اندھرا پردیش۔

سید شاہ ابو الحسن قربی ویلوری متوفی ۱۱۸۲ھ، دکن کے معروف عالم اور صاحب معرفت صوفی شاعر گذرے ہیں، انھوں نے فارسی اور عربی دونوں میں متعدد تصانیف یادگار چھوڑی ہیں، اردو میں بھی زیر تبصرہ دیوان ان کی یادگار ہے، زبان و بیان کے لحاظ سے خواہ اس کو کوئی خاص اہمیت نہ دی جائے، مگر اردو زبان کی ابتدائی نشو و نما اور اس کو مقبول عام بنانے میں ان کی خدمات کو ہمیشہ سراہا جائے گا، پروفیسر فضل اللہ صاحب نے تاریخ ادب اردو کی اس گمشدہ کڑی کی تلاش کرکے اردو ادب پر ایک احسان کیا ہے، اس طرح کی کوششوں سے اردو ادب کی تاریخ کے بہت سے گوشے سامنے آجاتے ہیں، اس لیے ان کا یہ کام قابلِ ستایش ہے۔

متاعِ شوق - از شاغل قادری، صفحات ۱۹۱، کتابت و طباعت بہتر۔ پتے: کتاب گھر باری روڈ گیا۔ کتاب منزل سبزی منڈی پٹنہ۔ قیمت ۳ روپے

شاغل قادری صاحب بہار کے معروف کہنہ مشق شاعر ہیں، نظم و غزل دونوں میں ان کا قلم یکساں چلتا ہے، ان کی نظموں میں روانی، برجستگی اور واقعیت ہوتی ہے، اور ان کی غزلیں لفظی خوبیوں کے ساتھ درد و سوز کا بھی اچھا نمونہ ہیں، دو شعر ملاحظہ ہوں:

اپنے خون کا ان پہ کیوں دعویٰ کیا   اے دلِ نادان یہ تو نے کیا کیا
ہو اسے سود و زیاں کی فکر کیوں   جس نے تیرے عشق کا سودا کیا

ان کی غزلوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں ہے، مگر اکثر انتخاب ہیں، امید ہے کہ یہ مجموعہ شوق سے پڑھا جائے گا۔

م، ج

جلد ۹۷ ماہ صفر المظفر ۱۳۸۶ھ مطابق ماہ جون ۱۹۶۶ء عدد ۶

مضامین

شذرات — سید صباح الدین عبد الرحمٰن — ۴۰۲-۴۰۴

مقالات

غنی کشمیری — جناب علی جواد صاحب زیدی — ۴۰۵-۴۲۰
طلاق ثلاثہ — جناب مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی — ۴۲۱-۴۴۴
امام دارمی اور ان کی سنن — جناب مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی رفیق دار المصنفین — ۴۴۵-۴۶۵
عوارف المعارف کا ایک قدیم نسخہ — جناب حکیم محمد عمران خاں صاحب سیدیہ ڈسٹرکٹ لائبریری ٹونک — ۴۶۶-۴۷۱

تلخیص و تبصرہ

قاضی جرجانی کے تنقیدی افکار — جناب سید احتشام احمد صاحب ندوی ایم اے بی ٹی ایچ (علیگ) لکچرار شعبہ عربی وکٹیشور یونیورسٹی اندھرا پردیش — ۴۷۲-۴۷۶
مطبوعات جدیدہ — م، ج — ۴۷۷-۴۸۰

شذرات

حکومتِ ہند کی ساہتیہ اکیڈمی نئی دہلی نے اب تک جو مفید اور اہم علمی کارنامے انجام دیئے ہیں، اُن کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس خالص علمی ادارہ نے ہندوستان کے علمی ضمیر کی حیثیت اختیار کر لی ہے، یہ ملک کی چودہ زبانوں کے علاوہ، انگریزی، سندھی اور میتھلی کی بھی سرپرست ہے، ۱۹۵۴ء میں قائم ہوئی، اس کی تشکیل کی غرض و غایت یہ ہے کہ اس کے ذریعہ ہندوستان کی مختلف زبانیں ایک دوسرے کے کاموں سے واقف ہوں، اسی لئے اس کے پروگرام میں ہندوستان کی مختلف زبانوں کے لٹریچر کی کتابیات، تواریخ، اور اُن کے مشاہیر سے متعلق مفید معلومات فراہم کرنا، اور ہر زبان کے اچھے لٹریچر کو مختلف زبانوں میں منتقل کرنا ہے،

اس کے صدر ڈاکٹر سروپلی رادھا کرشنن، اور نائب صدر ڈاکٹر ذاکر حسین ہیں، اس وقت اس کی عمومی مجلس میں ۸۰ ممبر ہیں، جن میں جناب ام۔ سی چھاگلا وزیر تعلیم حکومت ہند کے علاوہ مسلمانوں میں آسامی زبان کے جناب سید عبدالملک، اردو کے پروفیسر محمد مجیب، کشمیری کے جناب اختر محی الدین، مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر آل احمد سرور اور عثمانیہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر عبدالمعید خان نمائندے ہیں، پروفیسر ہمایوں کبیر بھی ایک ممتاز اہلِ علم کی حیثیت سے منتخب کئے گئے ہیں، ہندوستان کی سولہ زبانوں کے علیحدہ علیحدہ مشاورتی بورڈ بھی ہیں، جن میں اردو کے بورڈ کے اراکین ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر محمد مجیب، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، راجندر سنگھ بیدی، سجاد ظہیر، آنند نرائن ملا، اور پروفیسر آل احمد سرور (کنوینر) ہیں،

اکیڈمی کی طرف سے اب تک بعض بہت ہی مفید کام انجام پا چکے ہیں، مثلاً ۱۹۶۲ء میں بیسویں صدی میں ہندوستانی لٹریچر کے نام سے اس کی پہلی جلد شائع ہوئی، جس میں آسامی، بنگالی، انگریزی، اور گجراتی لٹریچر کی کتابیات ہیں، دوسری جلد کنڑا، کشمیری، اور ملیالم کی کتابیات پر مشتمل ہے، اسی طرح دو اور جلدیں ہوں گی، ۱۹۶۲ء میں ہندوستان کے پانچ ہزار علمی مشاہیر پر ایک جلد Who's who of Indian writer کے نام سے شائع ہوئی ہے جو بیرونی ملکوں میں بھی مقبول ہوئی، اس کی طرف سے معاصرانہ ہندوستانی لٹریچر کے نام سے بھی ایک اور اہم کتاب نکلی ہے جس کے ترجمے ہندی، ملیالم، تامل، اور تلیگو میں بھی ہوئے ہیں،

اکیڈمی کے سامنے ہندوستان کی مختلف زبانوں کی تاریخیں لکھانے کا بھی پروگرام ہے، جن میں آسامی، بنگالی، کنڑا، اور ملیالم کی زبانوں کی تاریخیں شائع ہو چکی ہیں، ہندوستان کے نامورانِ علم و ادب پر بھی علیحدہ علیحدہ جلدیں تیار ہو رہی ہیں، اردو میں غالب پر ایک جلد تیار کرنے کا کام پروفیسر محمد مجیب کے سپرد کیا گیا ہے، "معاصرانہ ہندوستانی افسانے" کے نام سے انگریزی میں کئی جلدیں ترتیب دی جا رہی ہیں، ہندوستان کی مختلف زبانوں کی شاعری سے واقفیت پیدا کرنے کی خاطر آسامی، کشمیری، ملیالم، پنجابی، تامل، تلیگو اور اردو شعرا کے انتخابات شائع کیے گئے ہیں، اکیڈمی کو اقوام متحدہ کے علمی اور ثقافتی شعبہ یونسکو کا تعاون بھی حاصل ہے، اس سلسلہ میں بعض ہندوستانی ناول بھی انگریزی میں ترجمہ کئے گئے ہیں، اردو کے ناولوں میں امراؤ جان ادا کا انتخاب ہوا ہے، لیکن اس کی جگہ پر کسی اور ناول کا انتخاب ہوتا تو زیادہ اچھا تھا،

اکیڈمی مولانا ابوالکلام آزاد کی تصانیف کو بھی شائع کرا رہی ہے، چنانچہ اس کی طرف سے اُن کی تفسیر ترجمان القرآن کی پہلی جلد شائع ہو چکی ہے، جس کو ڈاکٹر ذاکر حسین کی نگرانی میں پروفیسر محمد اجمل خاں اور ڈاکٹر عبدالمعید خان نے مل کر تیار کیا ہے، اس کی دوسری اور تیسری جلدیں زیر طبع ہیں، مولانا کے تذکرہ کو جناب مالک رام صاحب ایڈٹ کر رہے ہیں، اکیڈمی کی طرف سے ٹیگور پر بھی کتابیات تیار ہو رہی ہیں، اُن کی سو سالہ سالگرہ کے موقع پر اکیڈمی نے اُن کی نظموں، ڈراموں اور دوسری تحریروں کے خاص ایڈیشن مختلف زبانوں کے ترجموں کے ساتھ شائع کئے، اسی طرح سوامی ویویکانند کی سالگرہ ۱۹۶۳ء میں منائی گئی تو ان کے متعلق تامل، پنجابی، اردو، ملیالم اور مرہٹی میں معلومات فراہم کئے گئے، تامل زبان کا ادبی شاہکار تیرکورل ہے، اس کا اردو ترجمہ جناب حسرت سہروردی نے کیا ہے جو اکیڈمی کی طرف سے شائع ہو گیا ہے، اس طرح مختلف عنوانات پر گذشتہ تیرہ سال کے اندر یہاں سے مختلف زبانوں میں ۴۰۰ کتابیں نکل چکی ہیں، اکیڈمی کی یہ علمی سرگرمیاں ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہیں،

اکیڈمی کی طرف سے ہر سال ہندوستان کی مختلف زبانوں کی اہم کتابوں پر پانچ پانچ ہزار کے انعامات کا اعلان ہوتا رہتا ہے، جو مصنفوں کے لئے بڑا علمی اعزاز سمجھا جاتا ہے، اردو میں اب تک حسب ذیل کتابوں پر انعامات مل چکے ہیں، یادش ومشیت از جناب ظفر حسین خاں، قومی تہذیب کا مسئلہ از ڈاکٹر عابد حسین، میر تقی میر از ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، آتش گل از جگر مرادآبادی، اردو ڈرامہ اور اسٹیج از سید مسعود حسن رضوی، گل نغمہ از فراق گورکھپوری، دیوان غالب از امتیاز علی عرشی، یادیں از اختر الایمان، آندھی میں چراغ از خواجہ غلام السیدین، میری صدیث عمر گریزاں از آنند نرائن ملا، ایک چادر میلی سی، از راجندر سنگھ بیدی، اکیڈمی جس علمی رواداری، فراخدلی، اور بے تعصبی سے اپنے کاموں میں مشغول ہے اس سے امید ہے کہ ملک میں علمی یگانگت، ادبی موافقت اور لسانی یکجہتی کی جو کمی ہے وہ اسکے ذریعہ سے ضرور پوری ہو جائے گی،

گذشتہ مہینہ نیاز فتحپوری کی وفات اکیاسی سال کی عمر میں کراچی میں ہو گئی، معارف کو انکی پچھلی زندگی میں انکے بعض دلآزاد مذہبی مضامین سے بڑا اختلاف رہا، لیکن انھوں نے اظہار انابت کر کے آخر میں مذہبی دلآزاری چھوڑ دی تھی، ان کے علمی ذوق میں بڑی رنگا رنگی تھی، رسالہ نگار کے اڈیٹر ہونے کیساتھ، مذہب، تاریخ، سوانح، ناول نگاری، افسانہ نویسی اور شعر و ادب پر بھی طبع آزمائی کرتے رہے، اپنے بعض مذہبی مضامین کی وجہ سے تو مطعون ہوئے، اچھے مورخ، اور اچھے سوانح نگار بھی نہ ہو سکے لیکن انکا نام اچھے ناول نگار، عمدہ افسانہ نویس اور شعر و ادب کے بلند پایہ نقاد کی حیثیت سے اردو زبان کی تاریخ میں خصوصیت کیساتھ برابر لیا جائیگا، وہ اپنے رسالہ نگار کے ذریعہ سے جو علمی و ادبی خدمت انجام دیتے رہے وہ بھی انکے اہم کارناموں میں شمار ہوگا، دعا ہے کہ اللہ تبارک تعالیٰ ان کی کمزوریوں کو اپنے دامن عفو میں جگہ دیں، اور ان کو اپنی رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائیں، آمین،

ان سطروں کے لکھتے وقت جناب مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی ناظم دارالمصنفین و اڈیٹر معارف کا خط بمبئی سے موصول ہوا کہ وہ ۴ مئی ۱۹۶۶ء کو سفر حج سے بخیر واپس پہنچ گئے، دعا ہے کہ اللہ تبارک تعالیٰ انکے حج کو قبول فرمائیں، اور وہ اپنی آئندہ زندگی میں اسکے خیر و برکت سے عرصہ دراز تک اس ادارہ کی خدمت انجام دیتے رہیں، آمین ثم آمین،

مقالات

غنی کشمیری

از جناب علی جواد صاحب زیدی

ملا محمد طاہر غنی کا تعلق کشمیر کے مشہور قبیلۂ اشائی سے ہے[1]، غلام علی آزاد نے اس قبیلے کا نام "اشئی"[2] اور نواب صدیق حسن خاں نے "اشی" بتایا ہے[3]، حسین قلی خاں نے غنی کو "اشوی" لکھا ہے[4]، اس اعتبار سے قبیلے کا نام "اشو" ہونا چاہیے، لیکن میرا خیال ہے کہ "شمع انجمن" اور "نشتر عشق" دونوں ہی نے "مآثر الکرام" کو مشعل راہ بنایا ہے، اور کاتبوں نے ہمزہ کو حذف کر کے اختلاف پیدا کر دیا ہے، کشمیری مورخین میں خواجہ محمد اعظم دیدہ مری نے قبیلے کا نام "اشائی" اور پیرزادہ غلام حسن کوئہامی نے "عشائی" ظاہر کیا ہے، دیکھنے میں یہ صرف املاء کا فرق معلوم ہوتا ہے، لیکن وجہ تسمیہ نے اس فرق کو بنیادی بنا دیا ہے،

اس فرق کے اسباب پر غور کرنے سے پہلے یہ بات دھیان میں رکھنے کی ہے کہ غلام حسن کوئہامی نے اگرچہ قبیلے کا نام عشائی لکھا ہے، لیکن حیرت ہے کہ نہ صرف غنی کے ذکر میں[5] بلکہ مختار شاہ اشائی کے ذکر میں[6] بھی قبیلے کے نام کا املاء "الف" سے کیا ہے۔

بہر حال غلام حسن کوئہامی نے لکھا ہے کہ یہ قبیلہ ملک خراسان کے عیشاو نامی گاؤں سے

---

[1] تاریخ کشمیر اعظمی (تاریخ واقعات کشمیر) ص ۱۷۱ مطبوعہ [2] مآثر الکرام ج ۲ ص ۱۰۳ مطبوعہ [3] شمع انجمن ص ۳۴۳ [مطبوعہ ۱۲۹۳ھ] [4] نشتر عشق (مخطوطہ بانکی پور) [5] تاریخ حسن حصہ چہارم ص ۱۹ مطبوعہ [6] ایضاً ص

ہجرت کرکے وارد کشمیر ہوا، اب اہل کشمیر نے عیشاوری کو مخفف کرکے "عشائی" کر دیا ہے،[1] ڈاکٹر صوفی نے اپنی تصنیف کشمیر میں لکھا ہے کہ انھوں نے اپنے طویل سفر ایران کے دوران اس گاؤں کی بہت کھوج لگائی، لیکن کوئی پتہ نہ چلا اور علمائے ایران بھی اس کی نشاندہی سے قاصر رہے،[2] لیکن متین الزمان نے مولف تاریخ حسن کی رائے سے اتفاق کیا ہے[3]۔

بظاہر تاریخ حسن ہی کو بنیاد بنا کر ریاست جموں و کشمیر کی 'رپورٹ مردم شماری (۱۹۱۱ء)'[4] میں اشائیوں کے ابتدائی وطن کو خراسان کے قریب بتایا گیا ہے، لیکن گاؤں کا نام عیشاوری کی بجائے اشور یا عشور کر دیا گیا ہے، اسی سے 'اشوری' یا 'عشوری' اور بعد میں بگڑ کر 'اشائی' یا 'عشائی' ہو گیا، اس کے برعکس حاجی مختار شاہ اشائی کا یہ بیان ہے کہ 'اشائی' اصلاً بخارا کے رہنے والے تھے،[5] شاہ ہمدان[6] کے ہمراہ کشمیر آئے اور یہیں رہ پڑے، بخارا اور خراسان کی وطنیت کے بارے میں یہ بیانات متضاد ضرور ہیں، لیکن ان میں مطابقت کی بھی ایک شکل ہے، ممکن ہے کہ اشائیوں کے اجداد اصلاً بخاری رہے ہوں، پہلے بخارا سے ترک وطن کرکے خراسان آئے ہوں اور پھر وہاں سے شاہ ہمدان کی معیت اختیار کی ہو،

محمد الدین فوق نے "تواریخ اقوام کشمیر" میں "ایک محترم عشائی معزز عہدہ دار" کی تحریر کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے، کہ اس قبیلہ کے مورث اعلیٰ "خواجہ محمد سنگین کشمیری الاصل تھے، اور جناب امیر سید علی ہمدانی کی تشریف آوری سے پہلے ہی مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے،"[7] اس کے برعکس "روضۃ الابرار" کی یہ روایت ہے کہ خواجہ سنگین شاہ ہمدان کے ہمراہ کشمیر میں آئے، وہ خود اور ان کے فرزند سب صالح اور نیکو کار تھے، اور تجارت کا کام کرتے تھے، اشراق سے نماز پیشین تک دوکان پر بیٹھتے پھر نماز عصر تک

---

[1] "تاریخ حسن" [2] "کشمیر" [3] بحوالہ "ایران صغیر" از عبد الحمید عرفانی [4] "رپورٹ مردم شماری (۱۹۱۱ء)" ص ۲۰۵ فٹ نوٹ

[5] رسالہ دفن شال بافی مسٹر الٹر لارنس بھی اشائیوں کو سنل کہا ہو [6] حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی جنھیں احتراماً شاہ ہمدان بھی کہتے ہیں،

[7] تواریخ اقوام کشمیر ص ۲۳۲ (طبع ثانی)

کار خانے کی دیکھ بھال کرتے، نماز عصر کے وقت سے نماز عشا تک مسجد ہی میں قیام کرتے تھے، مدت تک ان کے خاندان کا یہی طریقہ رہا، اس وجہ سے یہ لوگ اشائی کہلانے لگے،[1]

اس کے علاوہ ایک اور بیان عوام میں مشہور ہے، کہتے ہیں کہ خواجہ سنگین کم از کم رات کا کھانا لازمی طور پر شاہ ہمدان کے ہمراہ کھایا کرتے تھے، حضرت کی اصطلاح میں رات کے کھانے کو غذائے عشا کہتے تھے، ایک دن اتفاق سے خواجہ سنگین کھانے پر نہ آسکے تو شاہ ہمدان نے پوچھا کہ "ہمارا عشائی کہاں ہے"، حضرت کی زبان، زبانِ خلق تھی، اسی دن سے یہ "عشائی" مشہور ہو گئے،[2]

ایک طرف یہ روایتیں ہیں اور دوسری طرف بیشتر کشمیری مورخ 'اشائی' کا املا عین کی بجائے الف سے کرتے ہیں، تاریخ حسن بھی مستثنیات میں نہیں ہے، خواجہ کمال اشائی، خواجہ نور الدین اشائی اور خواجہ محمد صالح اشائی میں اشائی کا املا، الف ہی سے ہے، خود غنی کشمیری کے حال میں لکھا ہے کہ "از قبیلۂ اشائی ہاست"[3] اگر "اشائی" الف ہی سے صحیح ہے، تو عشا کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ 'روضۃ الابرار' نسبتہً حال کی تالیف ہے، اس لیے وجہ تسمیہ کے سلسلے کی روایتوں کو حرف آخر سمجھ لینا درست نہ ہوگا، لیکن صرف ایک شبہہ کی بنا پر یہ روایت مسترد بھی نہیں کی جا سکتی، عین ممکن ہے کہ امتداد زمانہ سے املا میں تبدیلی آگئی ہو،

خواجہ جلال الدین (عرف خواجہ سنگین) نے محلہ علاء الدین پورہ (سری نگر) میں کئی مکانات تعمیر کرائے اور پتھروں کی مسجد بنوائی، چونکہ اس کے پہلے یہاں پتھروں کی کوئی مسجد نہ تھی، اس لیے یہ مسجد سنگین کہلائی، اور اسی مناسبت سے اس کے بانی خواجہ سنگین کہلانے لگے، اشائیوں کی ایک شاخ راجوری کدل کے پار آباد تھی، اور غنی کشمیری کا تعلق اسی شاخ سے تھا،[4] ایک اور شاخ فتح کدل میں تھی،

---

[1] تواریخ اقوام کشمیر ص ۲۳۲ [2] ایضاً ص ۲۳۳-۲۳۲ [3] تاریخ حسن حصہ چہارم ص ۱۹، مطبوعہ گورنمنٹ پریس، سری نگر [4] یہ اطلاع محمد امین دارابجے دی ہے جو اسی قبیلۂ "اشائی" کی ایک فرد ہیں، اور فارسی کے شاعر بھی ہیں،

جس میں خواجہ طاہر رفیق نے بڑا نام پیدا کیا، فتح کدل (سری نگر) میں انکی بنا کردہ مسجد اشائی آج بھی موجود ہے۔

چند نمایاں اہل خاندان اشائیوں کا خاندان علماء اور صلحا کا خاندان رہا ہے، خواجہ سنگین کے علاوہ خواجہ نور محمد، خواجہ حکیم شیخ محمد چشتی، خواجہ محمد امین، خواجہ عباد اللہ، خواجہ حفیظ اللہ، خواجہ ابراہیم اور خواجہ طاہر رفیق نامی عالمان باعمل گزرے ہیں،[1] کوئیہامی، خواجہ کمال اشائی کو "واقف سراپردۂ یکتائی" لکھتا ہے،[2] خواجہ نور الدین اشائی مفسر بھی تھے اور صاحب سلوک بھی،[3] خواجہ محمد صالح اشائی صاحب حال و قال و کشف و کرامات و مجاہدہ و مشاہدہ تھے،[4] خواجہ طاہر رفیق کو شیخ عبد الشکور سہروردی کی جانب سے خرقۂ خلافت عطا ہوا تھا، اور آپ چاروں سلسلوں۔ قادریہ، نقشبندیہ، سہروردیہ اور کبرویہ۔ میں صاحب سند تھے، ان کی کرامتیں مشہور ہیں،

علم اور صفائے قلب کے ساتھ درس و تدریس کی خدمت میں بھی اس خاندان کے کچھ افراد نے نام پیدا کیا، ان ہی میں غنی کشمیری کے بھائی ملا محمد زماں نافع بھی تھے، خواجہ طاہر رفیق کے واسطے سے شیخ یعقوب صرفی بھی عزیز ہوتے تھے، جن کا علم و فضل محتاج ذکر نہیں ہے، حاجی مختار شاہ اشائی متخلص بہ حاجی تک (جو تیرہویں صدی ہجری میں گذرے ہیں) یہ علمی روایت اس خاندان میں باقی رہی، مختصر یہ ہے کہ اس خاندان کا ماحول علمی اور روحانی رہا ہے۔ اور اس ماحول کا اثر غنی کی زندگی میں صاف نمایاں ہے،

ولادت کسی تذکرہ نگار نے نہ تو غنی کے والد کا نام بتایا ہے اور نہ تاریخ ولادت کا ذکر کیا ہے، قیاس آرائی کے لیے بھی کافی مواد موجود نہیں ہے، مفتی محمد سعادت نے "تاریخ اعظمی" کے حاشیے پر سنہ ۱۰۴۰ھ کو غنی کا سال ولادت قرار دیا ہے، یہ بیان ظنی اور بے ثبوت ہے، کیونکہ جب سنہ ۱۰۴۲ھ میں صائب کشمیر آئے ہیں اس وقت غنی صاحب بیاض شاعر ہو چکے تھے، ظاہر ہے کہ یہ معجزہ دو برس کے سن میں تو نہیں ہی ہوا

۱؎ تاریخ اقوام کشمیر، ص ۲۳۴ ۲؎ "تذکرہ اولیائے کشمیر" (یعنی تاریخ حسن حصہ سوم) ص ۱۹۰ ۳؎ ایضاً ص ۲۵۴
۴؎ ایضاً ص ۲۶۷ ۵؎ "شعر العجم" ج ۳ ص ۱۹۸

ہوگا، علامہ شبلی نے غنی کو صائب کا "ہمدم و ہم قلم" تسلیم کیا ہے،[1] اس لیے صائب کی آمد و قیام کے وقت غنی نوجوان تو ضرور رہے ہوں گے، اسی قیاس پر محمد امین داراب نے اپنے ایک مسودے میں غنی کا سال ولادت سنہ ۱۰۲۰ھ قرار دے لیا ہے، لیکن یہ بھی قیاس محض ہے، میں ان قیاسی روایتوں پر اعتبار کرکے سنہ ۱۰۲۰ھ اور سنہ ۱۰۴۰ھ میں سے کسی ایک کو اختیار نہیں کرسکتا، ان میں سے موخر الذکر تو قطعاً ناقابل تسلیم ہے، سچ یہ ہے کہ ہمارے پاس ایسا کوئی مواد موجود نہیں ہے، جس کی بنا پر ہم کوئی قطعی سال ولادت متعین کرسکیں، صرف اتنا قطعی طور سے معلوم ہے کہ جب سنہ ۱۰۴۲ھ میں صائب کشمیر آئے تو غنی کی شاعری مسلم ہو چکی تھی، یقیناً یہ غنی کی جوانی کا زمانہ رہا ہوگا، اگر پچیس برس کا بھی سن مانا جائے تو ان کی ولادت سنہ ۱۰۱۷ھ یا اس سے کچھ پہلے ہونا چاہیے،

نام غنی کا نام محمد طاہر ہے، اور اس کے بارے میں روایت ہے کہ چونکہ غنی کے والد کو خواجہ طاہر رفیق سے اعتقاد خاص تھا، اس لیے انھوں نے حصول سعادت کے لیے بچے کا نام محمد طاہر رکھا،

تعلیم غنی کی تعلیم و تربیت کے حالات بھی تذکروں میں نہیں ملتے، نصرآبادی نے صرف اتنا لکھا ہے کہ "در تحصیل علوم سعی نمودہ"۔[2] شیر خاں لودی اور دوسرے تذکرہ نگاروں نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ "بجودت طبع و ادراک در فنون و علوم بر اوستاد چیرہ دستی می نمود"۔[3] دیوان غنی کے مرتب اور غنی کے شاگرد مسلم نے ضمنی طور سے ان کے علوم رسمی سے واقف ہونے کا ذکر کیا ہے، "معارف حقیقی را در لباس علوم رسمی روپوش می ساخت"۔[4] خود ملا کا لقب اس بات کا ثبوت ہے کہ انھوں نے رسمی علوم میں مہارت پیدا کرلی تھی، اس کے علاوہ خاندانی روایات کا بھی تقاضا یہی ہے کہ انھوں نے شروع ہی سے طلب علم میں سعی کی ہوگی، فانی سے انھوں نے علوم عقلیہ اخذ کیے تھے، ان کے طبیب ہونے

۱؎ شعر العجم ج ۳ ص ۱۹۸ ۲؎ تذکرہ نصرآبادی ص ۴۴۵ چاپخانہ ارمغان تہران ۳؎ "مراۃ الخیال" ص ۱۶۲-۱۶۱ (مطبوعہ بمبئی
۴؎ "دیوان غنی" ص ۵۵ [مطبوعہ منجانب جموں اور کشمیر اکیڈمی آف آرٹس کلچر اینڈ لینگویجز" سری نگر]

کا ذکر بھی آیا ہے، بعض اشعار میں بھی اشارہ ہے، اس کے معنی یہ ہوئے کہ عام علوم کے علاوہ طب کا فن بھی انھوں نے حاصل کر لیا تھا۔

غنی کے استاد غنی کے خاندانی ورثہ، علم و فضل اور ابتدائی رسمی تعلیم پر ملا محسن فانی کی تربیت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا، غلام علی آزاد کی روایت ہے کہ "غنی ابتدائے شعور سے ملا محسن فانی کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے، چونکہ ذہین اور بلند طبع تھے، اس لیے تھوڑے ہی عرصہ میں ایک شایستہ حیثیت بہم پہنچالی، اور آخر کار بحر سخن کی غواصی میں مصروف ہوئے"[۱]۔ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ فانی کس زمانے سے درس و تدریس میں مصروف ہوئے تو غنی کے بدو شعور کے بارے میں بھی کچھ پتہ چلے، یہ سوچ کر میں نے تذکروں کی ورق گردانی شروع کی لیکن اس معاملے میں بھی تذکروں نے چند الجھنیں پیش کیں،

غلام حسن کویہامی نے لکھا ہے کہ "علوم عقلی و نقلی کے حصول کے بعد فانی نے ہندوستان کے اطراف و اکناف کی سیاحت کی اور زمانے کے نیک و بد کو بہت آزمایا، ہر مذہب کے ماننے والوں سے آشنائی کی اور مذہبوں اور ملتوں کی تحقیق کی اور ایک کتاب اسی موضوع پر "دبستان مذاہب" کے نام سے تصنیف کی، اپنی علمی شہرت کے باعث دارا شکوہ کی صحبت میں رسائی پائی اور ایک مدت تک انکے ندیم رہے، پھر کشمیر کی صدارت کا عہدہ حاصل کر کے اپنے وطن آئے، یہاں صدارت کی ذمہ داریوں کے ساتھ وہ درس و تدریس میں مشغول ہوئے اور باکمال شاگرد پائے، کہتے ہیں کہ شروع شروع میں مذہب آزاد اور ہر ملت سے صلح کل رکھتے تھے، اور فلسفیوں (حکماء) کے مذہب پر اعتقاد تھا، لیکن آخر عمر میں حضرت میاں محمد امین دار کی خدمت میں مشرف ہوئے اور ان کے دامانِ عاطفت کی طرف توبہ کا ہاتھ بڑھایا اور خیالات باطل سے درگذرے، اور عقیدہ کامل بہم پہنچایا"[۲]۔

[۱] مآثر الکرام ص ۱۰۳ ج ۲۔ مآثر الکرام کی فارسی عبارت "شمع انجمن" کے مولف نواب صدیق حسن خاں نے لفظ بہ لفظ نقل کر دی ہے صرف پہلا جملہ چھوڑ دیا ہے، یہ بات تذکروں میں عام ہے[۲] تاریخ حسن جلد سوم ذکر فانی، ایضاً دیکھیے اردو ترجمہ "تذکرۂ اولیائے کشمیر" ص ۲۲۵۔

اس بیان میں اطراف و اکناف ہند کی سیاحت اور تحقیق مذاہب کی بات "دبستان مذاہب" کی تصنیف سے وابستہ ہے لیکن یہ روایت خود مشتبہ ہے، ڈاکٹر امیر حسن عابدی کی تحقیق کے مطابق اس کتاب کا فانی سے کوئی واسطہ نہیں ہے[۱]، پیرزادہ غلام حسن کویہامی کی یہ روایت بھی مشکوک ہے کہ فانی کو کبھی کشمیر کی صدارت ملی تھی، کشمیر میں فانی کا قیام تو صدارت سے معزولی کے بعد ہوا اور اس کا سبب طامس بیل نے یہ بیان کیا ہے کہ جب نذر محمد خاں والی بلخ کو مراد بخش نے شکست دی اور اس کے اموال ضبط کیے تو ضبط شدہ سامان میں محسن فانی کا ایک دیوان بھی ملا جس میں نذر محمد خاں کی شان میں ایک قصیدہ بھی تھا، اس قصیدے کی دریافت کے بعد فانی شاہجہاں کی نظروں سے گر گئے اور صدارت الہ آباد سے معزول ہوئے، لیکن ان کے حسب حال ایک سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا گیا جو وہ تمام عمر پاتے رہے، اور کشمیر ہی میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے[۲]۔

اس بیان کی تصدیق محمد قدرت اللہ گوپاموی کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔

"بجوہر ذاتی و صفاتی مستعد بارگاہ شاہجہاں گشتہ، بخدمت صدارت الہ آباد چہرۂ اعتبار افروخت و بحسن خلق و سجیۂ رضیہ دران دیار مرجع خاص و عام گردید و خرقۂ خلافت از مولانا شیخ محب اللہ الہ آبادی پوشید آخر بسببی از منصب و خدمت بپایۂ عزل در آمدہ از مراحم بادشاہی بتقرر سالانہ معقول کامیاب شدہ بکشمیر رفت …… اوقات گرامی پیوستہ بشغل درس و تدریس مامور میداشت و از حلقۂ تدریس او اکثری از اہل کمال مثل ملا محمد طاہر غنی و حاجی اسلم اسلم علم شہرت بر داشتند"[۳]۔

ڈاکٹر عابدی نے بھی لکھا ہے کہ معزول ہونے کے بعد فانی کشمیر میں مقیم ہوئے … اور اپنا وقت

[۱] شیرازہ (سری نگر) ج ۸ ش ۱ ص ۱۸ [۲] ایضاً مقدمہ انگریزی "مثنویات فانی" ص ۱۶-۱۵ [۳] مفتاح التواریخ از طامس ولیم بیل ص ۲۷۵ [۴] تذکرہ "نتائج الافکار" ص ۵۴۲-۵۴۱

درس وتدریس میں صرف کرنے لگے۔[1] "ایران صغیر" میں بھی ان ہی بیانات کو صحیح مانتے ہوئے فانی کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ "در اواخر زندگانی از خدمت دولتی کنارہ کشی کردہ ومشغول تدریس وتعلیم علوم فلسفی وادبی بودہ۔"[2]

ان بیانات کا خلاصہ یہ ہے کہ فانی نے معزولی کے بعد ہی کشمیر میں مراجعت کی اور عالم گوشہ گیری میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا، "نتائج الافکار" اور "مفتاح التواریخ" کے بیانات ملتے جلتے ہیں، صرف فرق اتنا ہے کہ اول الذکر نے معزولی کا سبب نہیں لکھا ہے، بہرحال چونکہ کشمیر کا قیام معزولی کے بعد ہوا ہے، اس لیے صدارت کشمیر کی بات (جو "تاریخ حسن" میں کسی حوالہ کے بغیر درج کر دی گئی ہے) افسانہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی، پھر ایک ہی بات رہ جاتی ہے کہ معزولی فتح بلخ و بخارا کے بعد ہوئی، اگر یہ صحیح ہے تو معزولی ۱۰۵۵ھ کے آس پاس ہوئی ہوگی، اور یہ زمانہ کسی طرح بھی غنی کا بدو شعور نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ زمانہ کم از کم ان کے کمال شباب کا ہے،

اگر غنی ۱۰۵۵ھ کے آس پاس فانی کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے تو اسے ابتدائی تعلیم سے کوئی علاقہ نہیں ہو سکتا، انھوں نے صرف حصول فضیلت یا تکمیل علوم حکمیہ کی غرض سے فانی کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا ہوگا، جبھی تو شیر خاں لودی نے لکھا ہے کہ

"بمدد طبع دراک در علوم وفنون بر استاد چیرہ دستی نمودہ، ہرگاہ شیخ را مسئلہ مشکل شدی از وی (غنی) استفسار نمودی۔"[3]

اب ذرا اس بات کو ذہن میں رکھیے کہ فانی کو صاحب مراۃ الخیال "فاضل متبحر" کہتے ہیں اور صاحب صبح گلشن "اکثر علوم میں یکتا" اور ملا یعقوب صرفی کے تلامذہ میں "فاقد النظیر" قرار دیتے ہیں، محمد صالح کنبو انھیں تمام علوم کا جامع بتاتے ہیں، صاحب بستان بے خزاں بھی ان کے

[1] مثنویات فانی، مقدمہ فارسی ص ۷، [2] ایران صغیر ص ۱۵۹ [3] مراۃ الخیال ص ۱۶۱

فضل وتبحر پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں، اور مؤلف "نتائج الافکار" انھیں "فضل وکمال میں بے نظیر" گردانتے ہیں، قطع نظر اس سے کہ ایسا اہل کمال کیا غنی سے استفسار مسائل کرتا ہوگا یا نہیں، یہ تو مانا ہی نہیں جا سکتا کہ وہ مسائل علمیہ میں کسی مبتدی سے رجوع کرتا ہوگا۔ خود مراۃ الخیال کی عبارت بتاتی ہے کہ مشکل مسائل میں استفسار کرتے تھے یعنی جن مسائل کے بارے میں غنی سے سوال کیا جاتا تھا، ان کا تعلق باریک علمی اور فنی نکات سے رہتا تھا، میرے خیال میں بدو شعور کی بات بعید مشتبہ بلکہ ناقابل یقین ہے،

غنی کی شاگردی کا تعلق زیادہ تر شاعری اور علوم باطنی سے رہا ہوگا، تکمیل علوم کے لیے انھوں نے خصوصی درسوں میں بھی شرکت کرلی ہوگی، اتنا ضرور تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ غنی نے شاگردی کی حیثیت سے اپنی ذہانت اور ژرف نگاہی کا پورا ثبوت دیا، غنی کی شاگردی کی نوعیت پر ان کے ہم عصر اور مرتب دیوان، محمد علی ماہر، کے اس شعر سے بھی روشنی پڑتی ہے، جو غنی کی وفات کے قطعۂ تاریخ کا پہلا شعر ہے

چو دادش فیض صحبت شیخ کامل محسن فانی
غنی سر حلقۂ اصحاب او در نکتہ دانی شد

غنی یقیناً پہلے ہی تحصیل علم کر چکے تھے، فانی کی صحبت پاکر ان کی نکتہ دانی کو چار چاند لگ گئے،

علوم ظاہری میں استفادہ کے علاوہ انھوں نے فانی سے روحانی علوم بھی حاصل کیے، مسلم نے دیوان غنی کے دیباچہ میں انھیں تصریحاً فانی کا شاگرد ومرید لکھا ہے اور آزاد بلگرامی نے ان لفظوں میں تصدیق کی ہے،

"(فانی) درویشی صوفی مشرب، صاحب ذوق بودہ، غنی کشمیری بخدمت وی کسب کمالات کردہ۔"[4]

شاعری کے سلسلے میں فانی کی شاگردی کی صاحب "صبح گلشن" نے باضابطہ تصریح کی ہے،

"ملا طاہر غنی وحاجی محمد اسلم سالم کشمیری کلام خود را پیش نظر اصلاحش می کشیدند وبطفیل شاگردی

[4] "ید بیضا"

دی در سخن سرائی برتبۂ استادی رسیدند"[۱]

یہاں اُس غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے جو پیرزادہ غلام حسن کو یہامی کے اس بیان سے پیدا ہوسکتی ہے کہ فانی آزاد خیال اور آزاد مذہب تھے، اور مذہب حکمیہ کو زیادہ پسند کرتے تھے، آخر عمر میں محمد امین دار کے مرید ہوکر سابقہ خیالات سے توبہ کرلی[۲]، جیسا کہ ہم پہلے بھی بتا آئے ہیں فانی صدارت الہ آباد کے زمانے ہی میں شیخ محب اللہ الہ آبادی کے مرید[۳] اور بقول نتائج الافکار خلیفہ ہوئے[۴]، ان کی مثنویوں اور اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ نہ صرف صوفی صافی بلکہ پیرو شریعت بھی تھے، خود کہتے ہیں،

راہ خدا غیر رہ شرع نیست ۔ مسلک آں اصل جز ایں فرع نیست

اپنی مثنوی "مصدر الآثار" میں شیخ محب اللہ الہ آبادی کی مدح کی ہے، اور اس میں حمد و نعت رسول و منقبت خلفائے اربعہ کے علاوہ، فضیلت کلمۂ طیبہ، نماز، روزہ، حج، زکوۃ، توبہ و توکل وغیرہ کا بیان ہے، مسلم جو فانی کا ہم عصر ہے، اپنے استاد غنی کے بارے میں صاف صاف لکھتا ہے کہ انھوں نے فانی سے کمالات باطنی حاصل کئے۔ مراۃ الخیال انھیں پاکیزہ روزگار بتاتا ہے ایسے ملا حسن کو یہامی کا یہ بیان کہ "بعلوم معنوی تعلیم و تلقین آنجناب (محمد امین دار) بہرہ مند گشت"۔ صرف سنی سنائی بات ہے، بلکہ مجھے تو یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ انھیں تسامح ہوگیا ہے، اور وہ محض فانی اور دوسرے ملا محسن کشمیری کو ایک دوسرے سے خلط ملط کر گئے، ان ملا محسن کا خود کو یہامی نے الگ سے ذکر کیا ہے[۵]، یہ دوسرے ملا محسن ہی محمد امین دار کے مرید تھے،

رہا فانی کے مذہب فلسفیانہ کا افسانہ، سو وہ دارا شکوہ کی ہم نشینی اور دبستان مذاہب کی

[۱] صبح گلشن ص ۳۰۰ [۲] تذکرہ "مخزن الغرائب" ذکر غنی از مولوی احمد علی خاں سندیلوی (مخطوطہ دار المصنفین)
[۲] تذکرہ اولیائے کشمیر (اردو) ص ۲۲۴ [۳] بزم تیموریہ ص ۱۹۰ [۴] ص ۳۰۸ [۵] تذکرہ اولیائے کشمیر (اردو) ص ۳۲۲

مبنیٔ تالیف کا شاخسانہ ہے، تذکروں کی چھان بین کرنے والے جانتے ہیں کہ اسی طرح "افسانہ از افسانہ می خیزد"۔ جو لطیفے اوپر دیکھا چکے ہیں ان کے علاوہ ایک اور بدیہی شہادت ہے، غنی کا زہد و اتقا ہر خاص و عام کو معلوم ہے، اگر فانی کے خیالات مذہبی درست نہ ہوتے تو غنی ان کی طرف مائل ہی نہ ہوتے، اور صرف انھیں اپنا شاگرد نہ بناتے، پھر ایک اور بالواسطہ ثبوت یہ ہے کہ فانی کا دیوان اورنگ زیب کے مطالعہ میں رہا کرتا تھا، اگر فانی کے خیالات راہ شرع سے ہٹے ہوئے ہوتے تو کم از کم اورنگ زیب کی سرپرستی انھیں حاصل نہ ہوتی،

در اصل فانی کے خلاف بھی کچھ عناصر کام کر رہے تھے، حاکم کشمیر ظفر خاں احسن مخالف اور درپے تضحیک تھا، اور پھر دارا شکوہ کی ندیمی کی وجہ سے بھی ایک گروہ ناراض تھا، ایسی مخالفتوں میں فانی کی اصل اہمیت پر بعض تذکرہ نویسوں کا پردہ ڈالنا غیر فطری نہ تھا، چنانچہ ایک افسانہ انھوں نے طریقۂ درس کے بارے میں اور ان کی محبوبہ کی ایک ہجو کی تشہیر اسی سلسلے کی کڑیاں معلوم ہوتی ہیں، طریق درس کے بارے میں روایت یہ ہے کہ "ان کے اکثر تلامذہ سادہ رو تھے، اپنی حویلی کے باغیچے میں انھوں نے ایک نشیمن مربع ایک حوض سنگی سمیت بنوایا تھا، اور اس کا نام حوض خانہ رکھا تھا، ٹھیک دوپہر کے وقت شاگرد ایک ایک کرکے وہاں جاتے اور سبق لیتے تھے[۱]، انھیں اسی کے ساتھ ساتھ بچی نامی ایک کشمیری طوائف سے جو نہایت ہی رعنا حسین اور زیبا تھی، وابستگی پیدا ہوئی، انھیں دنوں ظفر خاں ناظم کشمیر نے بھی اس سے تعلق خاطر پیدا کرلیا، نقد و جنس سے لاکھ فریب دیا، لیکن اپنی طرف مائل نہ پایا، آخر میں جل بھن کر بچی اور شیخ کی ہجو میں ایک غزل لکھ کر شہرت دیدی، یہ دو بیت اسی سے ہیں،

خفتہ را بیدار سازد باد دامان بچی ۔ مردہ را در جنبش آرد بوئے ایمان بچی
بستۂ حیض بچی شد شملۂ دستار شیخ ۔ رشتۂ تدبیر او شد بند تنبان بچی

[۱] تذکرہ اولیائے کشمیر (اردو) ص ۳۲۲

شیخ نے غزل سنی تو ملاحظۂ حکومت سے چپ رہے[1]۔ پھر بھی کلیۃً خاموش بھی نہیں رہے، ایک غزل میں ظفر خاں احسن کو بھی انھوں نے شایستہ انداز سے للکار ہی دیا۔

گو ظفر خاں، داغ شو امشب کہ فانی ایں غزل
در الہ آباد پیش قدر دانی خوانده است

بہر نوع، اگر جیجی سے عشق کی روایت صحیح بھی ہو تو متوازن عشقِ مجازی کبھی بھی عشق حقیقی کی راہ کا روڑا نہیں مانا گیا ہے، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بعد میں فانی نے اس سے بھی توبہ کر لی۔

فانی کے حلقۂ ارادت میں شامل ہونے کے بعد بالکل ہی تارکِ مراغبت دنیای دنی ہو گئے تھے، ریاضِ نفس کا یہ عالم تھا کہ بس پوست و استخوان تھے، اسباب دنیا میں کاغذ اور قلمدان کے علاوہ اپنے پاس کچھ بھی نہیں چھوڑا، گوشۂ تنہائی میں رہتے اور لوگوں کی صحبت سے نفرت کرتے تھے، لیکن فانی سے عقیدت کا یہ حال تھا کہ غنی نے "فنا فی الشیخ" کا مرتبہ حاصل کر لیا تھا۔

اگرچہ دونوں نے راہ سلوک اور راہِ علم میں اعلیٰ ترین منزلیں طے کیں، لیکن شہرتِ شاعری نے ان کے کمالات علمی و روحانی کو دبا دیا، فانی کے بارے میں محمد صالح کنبو نے اس بات کو صراحۃً لکھا ہے[2]

"شاعری دون مرتبہ آں والا فطرت است، و سخنوری کمین پایۂ آں تعیین سردار خطۂ فکرت است چوں بعض اوقات بفکر شعر می پرداز دو طرزِ شعر ابشاں قلم می طرازد لاجرم نام آں عالی مرتبت در جرگ شاعراں بقلم آورده از دیوانش ایں ابیات کہ دیوان دستور ایں سخن اند دریں دفتر ایراد نموده می آید"

اور ادھر غنی کے بارے میں ان کے شاگرد مسلم نے بعینہٖ یہی بات دیوان غنی کے دیباچے میں لکھی ہے:۔

"اگرچہ آں مجمع کمالات بشاعری بیشتر شہرت یافتہ و شعر ترش دریں باب تیز دستی بکار برده اما کمالات شعری او نمونہ ایست از کمالات دیگر و سخنان رنگینش گونہ ایست از جمال معنوی آں نیکو سیر...... چنانچہ خود نیز می فرماید۔

[1] مفتاح التواریخ ص ۵، ۲۔ ڈاکٹر امیر حسن عابدی نے اس محبوبہ کا نام "بجی" تحریر کیا ہے، غالباً جس نسخے سے انھوں نے نقل کیا ہے اس میں املا کی غلطی رہی ہوگی۔ [2] عمل صالح جلد ۳ حالات فانی

ز شعر من شده پوشیده فضل و دانش من
چو میوه کہ نماند بزیر برگ نہاں[1]

غرض فانی کی شاگردی سے غنی کی زندگی کا ہر گوشہ متاثر ہوا، اور انھوں نے متصوفانہ زندگی میں، شاعری میں اور علوم عقلی و نقلی میں فانی سے استفادہ اور ان کا اتباع کیا، اتنا ہی نہیں بلکہ بقول مسلم اس شاگردی نے انھیں "فنا فی الشیخ" کی منزل تک پہنچا دیا، لیکن بعض تذکروں میں بد و شعور سے فانی سے تعلیم حاصل کرنے کی جو روایت غنی کے بارے میں بیان کی گئی ہے، وہ نہ صرف محتاجِ تصدیق بلکہ تمام قرائن سے غلطی کی حد تک مشتبہ ہے۔

گھریلو زندگی

غنی کی گھریلو زندگی کے بارے میں ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں ہے، قدیم تذکرہ نویس ان باتوں کے ذکر کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے تھے، اب جو لوگ کچھ کہتے ہیں یا لکھتے ہیں ان میں قیاسات کو کافی دخل ہے، اور اس کے بغیر چارہ بھی نہیں، البتہ غنی کے تجرد کا ذکر کئی تذکرہ نویسوں نے کیا ہے، خود بھی کہا ہے کہ

چو من بہ بحر تجرد کس آشنا نبود
یکی ست پیرہن و پوست چوں حباب مرا

نصر آبادی نے لکھا ہے کہ "با وجود حداثت سن در کمال بی تعلقی بوده[2] اور مسلم نے نہ صرف "تارک مراغبت دنیای دنی" کے لقب سے یاد کیا ہے، بلکہ ترک و تجرید کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "از عزلت وارز وائے ذاتی بغیر از سخنان وحشی بہ کسی رام نشد و بجز معنی بیگانہ با ہیچکس آشنائی نمی کرد"[3]۔

ترکِ دنیا نہ صرف غنی کے تخلص سے آشکار ہے، بلکہ ان کے کئی اشعار میں اس کی طرف واضح اشارے پائے جاتے ہیں، مثلاً

غنی اگرچہ فقیر است ہمتی دارد
فشانده است بکونین دست خالی را

اگر شہرت ہوس داری اسیر دام عزلت شو
کہ در پرواز دارد گوشہ گیری نام عنقا را

از خلق بگوشۂ نشستم تنہا
میگردد ازیں رو سخنم گرد جہاں

[1] دیباچۂ دیوان غنی" از مسلم [2] تذکرۂ نصر آبادی" چاپ تہران ص ۴۴۵ [3] دیباچۂ دیوان غنی، از مسلم

غنی کی ساری زندگی نہایت ہی تنگدستی کے عالم میں بسر ہوئی، اسکی جھلک انکے اشعار میں بار بار ملتی ہے،

سرمایۂ من در آستیں دست تہی است
بر خاتم دو لتم نگیں دست تہی است

ما بفقر و فاقہ خورسندیم ہمچو آسیا
گر رسد روزی غبارِ خاطرِ ما می شود

رفتن بدرِ خانۂ مردم عیب است
امروز کہ فاقہ ہست در خانۂ ما

داغ افلاس چو ماہی دارم
خلق دانند کہ صاحب درمم

انھوں نے کہیں کہیں اپنے مختصر سے اور ٹوٹے پھوٹے مکان کا بھی ذکر کیا ہے

ما بلبلانِ بلند آشیانہ زیم خانہ را
خوش کردہ ایم خانۂ یک آشیانہ را

دیوار و در شکستہ بود خانہ مرا
رنگش مگر ز رنگِ رخ خویش ریختم

کلبۂ ما گرچہ بے روزن چو فانوس است لیک
بزم یاراں از چراغ خانۂ ما روشن است

دیوار و در خانۂ ما گرچہ ز ہم ریخت
صد شکر کہ در خاطر ما نیست غباری

اور یہ ٹوٹا پھوٹا مکان مال و متاع دنیا سے بھی یکسر خالی تھا، مسلم نے دیوان کے دیباچے میں صاف صاف لکھا ہے کہ غنی کے پاس کاغذ اور قلمدان کے علاوہ اسباب جہاں سے کچھ بھی نہ تھا، اس کو غنی نے اس شعر کے مصرعۂ اولیٰ میں ظاہر بھی کر دیا ہے کہ ؎

چوں نیست بجز خانہ مرا ہیچ متاعی
عیبم نتواں کرد اگر خانہ بدوشم

بس ایک بوریائے فقر زیب خانہ ہے اور وہ اسی میں مست ہیں، بلکہ اس بات پر خوش ہیں کہ یہاں اہل دول کا گزر نہیں ہے

فراغتی بنیستان بوریا دارم
مبادا رہ دریں بیشہ شیر قالی را

فقر و فاقہ سے نہ تو چہرے پر شکن آتی ہے اور نہ ان کے پائے ہمت میں لغزش، وہ ایک گوشہ گیر فقیر ہیں جو مال و دولت کی محفلوں سے کتراتے ہیں اور بادشاہوں اور امیروں کو خاطر میں

نہیں لاتے، دروازہ بند کیے گھر میں پڑے رہتے ہیں، اگر ان کے دروازے کھلتے ہیں تو صرف طالبانِ علم و عرفان کے لیے، ترک دنیا کے باعث صحبت عام کو بھی پسند نہیں کرتے اور اعزاء و احباب سے بھی کنارہ کش ہی رہتے ہیں، ایسے مجاہدۂ نفس کرنے والے کی گھریلو زندگی کیا ہوگی۔

وہ بادشاہوں اور امیروں کے خوان کرم سے دور بھاگتے ہیں، اور کسی کا احسان بھی اٹھانا نہیں چاہتے، جو روکھا سوکھا گھر پر میسر آجاتا ہے اسی پر قانع اور شاکر ہیں،

بچشمم آبرو نگی نیست خوان بادشاہاں را
کہ دارد کاسۂ درویش نعمتہائے الواں را

کاسۂ خود پر مکن زنہار از خوانِ کسی
داغ از احسانِ خورشید است بر دل ماہ را

ان کے استغنا کی حالت یہ تھی کہ وہ اپنے تنور کے لیے ہمسایہ سے آگ طلب کرنے کو بھی عار سمجھتے تھے ؎

علوِ ہمتم کے آتش از ہمسایہ می خواہد
نہاں خویش سازم گرم چوں گردوں تنورم

ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کا نسخۂ (اب) دیوان غنی ایک قصیدہ نما غزل سے شروع ہوتا ہے، جس کا مطلع ہے ؎

نیست موج جوی شیر از سنگِ خارا آشکار
کوہکن رہ شد سفید از گریہ چشم انتظار

مطبوعہ اور کئی قلمی نسخوں میں اس بحر میں چھوٹی چھوٹی کئی غزلیں درج ہیں اور ایشیاٹک سوسائٹی کی اس پچیس شعروں کی غزل کے اشعار ان نسخوں میں بکھر گئے، اگرچہ تازہ ترین اشاعت دیوان میں بھی دوسرے قلمی اور مطبوعہ نسخوں کی ہی تاسی کی گئی ہے، لیکن ایشیاٹک سوسائٹی کے نسخے میں جو تسلسل خیال ہے وہ جاذب توجہ یقیناً ہے، اس میں غنی کے حسب حال بھی چند اشعار ایک ترتیب سے درج ہیں، جس سے یہ بھی شبہہ ہوتا ہے کہ ممکن ہے، یہ کسی قصیدہ ہی کا جزو رہے ہوں، اس کا ذکر ذرا آگے آئے گا، یہاں اس غزل کے وہ اشعار سنیے جس سے ان کی پریشاں حالی اور استغنا پر روشنی پڑتی ہے ؎

روز خوش در زندگی ہرگز نصیبِ ما نشد — عمر در ماتم بسر بردیم چوں شمعِ مزار

بسکہ کوتاہ است دست از دامنِ دولت مرا — جامۂ بے آستیں پوشیدہ ام فانوس وار

ہمچو دنداں عاقبت شد شد دہانِ ما گرہ — دانۂ گر شد نصیب از کشتِ روزگار

خانہ ام را عاقبت گردید بام و در یکے — بسکہ ہمچوں مور گشتم پائمالِ روزگار

مصنفِ مشاہیرِ کشمیر نے ایک روایت یہ لکھی ہے کہ غنی نے اپنے رہنے کے لیے ایک مختصر سا کمرہ منتخب کر رکھا تھا، جب اس کمرے میں ہوتے تو دروازہ بند رکھتے اور کہیں جاتے تو کواڑ کھلے چھوڑ جاتے، ایک دوست کے استفسار پر یہ سبب بتایا کہ دکان کا اصلی مال تو میں ہوں، جب میں ہی نہ ہوں تو دروازہ بند کرنے کی کیا حاجت؟ ڈاکٹر اقبال نے "پیامِ مشرق" میں اس واقعہ کو نظم بھی کیا ہے:

غنی آں سخن گوئی بلبل صفیر — نوا سنجِ کشمیر مینو نظیر

چو اندر سرا بود در بستہ داشت — چو رفت از سرا تختہ را وا گذاشت

یکے گفتش اے شاعرِ دل رسے — عجب دارد از کارِ تو ہر کسی

بپاسخ چہ خوش گفت مردِ فقیر — فقیر و باقلیمِ معنی امیر

ز من آنچہ دیدند یاراں رواست — دریں خانہ جز من متاعی کجاست

غنی تا نشیند بکاشانہ اش — متاعی گران است در خانہ اش

چو آں محفل افروز در خانہ نیست — تہی تر ازیں ہیچ کاشانہ نیست[۱]

(باقی)

---

[۱] پیامِ مشرق ص ۱۲۰

طلاقِ ثلاثہ

از

جناب مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی

راقم الحروف نے ۱۹۵۷ء میں "اجتہاد اور تبدیلی احکام" کے عنوان سے جو سلسلۂ مضامین شروع کیا تھا، یہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

جن مسائل کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ عہدِ نبوی کے بعد ان میں خلفائے راشدین نے تبدیلی کی، ان میں ایک طلاق ثلثہ کا مسئلہ بھی ہے، یعنی اگر کوئی شخص ایک ہی نشست میں تین طلاقیں خواہ عدد کی تصریح کے ساتھ یا الفاظ کی تکرار کے ساتھ دیدے تو عہدِ نبوی میں ایسی تین طلاقوں کو ایک شمار کیا جاتا تھا، مگر حضرت عمرؓ نے اس میں یہ تبدیلی کر دی کہ ان کو ایک کے بجائے تین قرار دیا، اور چونکہ اسی پر امت کا تعامل ہے، اس لئے اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ حکومتِ وقت یا مرکزِ ملت کو اسلامی مسائل میں ہر طرح کی تبدیلی کا حق حاصل ہے۔

موجودہ دور میں جو لوگ اپنے کو اسلامی احکام میں تبدیلی کا حق دار سمجھتے ہیں، ان کی اصل ذہنیت تو یہی ہے کہ اسلامی مسائل میں اُن کو اُن کی خواہش کے مطابق کانٹ چھانٹ اور کتر بیونت کرنے کا پورا حق حاصل رہے، چنانچہ خلفائے راشدین کی اولیات سے لے کر متاخرین علماء کی اجتہادی تبدیلی احکام کی کوئی صورت بھی نظر آجاتی ہے تو اُسے وہ اپنے لئے دلیل بنانے کی کوشش کرتے ہیں، تاکہ اسلامی قانون

کے تاریخی تسلسل سے ان کا رشتہ منقطع بھی نہ ہونے پائے اور انکی رائے وزنی بھی معلوم ہو، مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے جب کوئی صالح تبدیلی اُن کی کسی خواہش کے خلاف پڑتی ہے، تو وہ اتباع سنت وعظ کہنے لگتے ہیں، اور پوری اُمت کے تعامل کو بدعت قرار دیتے ہیں، چنانچہ پاکستانی حکومت نے جو عائلی کمیشن مقرر کیا تھا، اُس نے متعدد مسائل میں تو پہلی صورت اختیار کی، یعنی خلفائے راشدین کے مقابلہ میں بعد کے کسی فقیہ یا موجودہ دور کے کسی مفکر کے اجتہاد کو ترجیح دی، مگر طلاق ثلثہ کے مسئلہ میں اُس نے اتباع سنت کا لبادہ اوڑھ لیا، اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ کتاب وسنت کے اتباع کے پیش نظر ہم حضرت عمرؓ کی تبدیلی کو تسلیم نہیں کر سکتے،

ہمیں اس وقت کمیشن کی رپورٹ پر کچھ لکھنا نہیں ہے، صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ اس وقت مسلمانوں کا حکمراں طبقہ خواہ کسی اسلامی ملک کا ہو، الا ماشاء اللہ وہ کسی وجہ سے بھی اسلام سے اپنا تعلق منقطع تو نہیں کرنا چاہتا، مگر چونکہ اس کی تعلیم و تربیت خالص مغربی طرز پر ہوئی ہے، اس لئے اس کے سوچنے کا انداز خالص مغربی ہوتا ہے، وہ یہ جرأت تو نہیں رکھتا کہ اسلامی قانون کے مقابلہ میں خواہ وہ معاشرت سے متعلق ہو یا معیشت وسیاست سے مغربی قانون کو کھلم کھلا ترجیح دیسکے، بلکہ وعظ و پند کی حد تک وہ اسلامی قانون کی فضیلت ماننے، اور اس کے سامنے عظمت کے پھول پیش کرنے کے لئے ہی تیار رہتا ہے مگر اس کے آگے وہ کوئی عملی قدم بڑھانا نہیں چاہتا، بلکہ جہاں اُسے دونوں میں کوئی ٹکراؤ ہوتا نظر نہیں آتا، وہاں کتاب وسنت کا کھلا تبع نظر آتا ہے، اور جہاں کوئی ٹکراؤ نظر آیا، یا اس کی خواہش اور منفعت پر کوئی ضرب پڑتی ہوئی دکھائی دی، یا اس کو اس خیال نے ستایا کہ دنیا میں ہم رجعت پسند مشہور ہو جائیں گے تو خلافت راشدہ کے تعامل یا اولیات[1] کو اور اس سے بھی نیچے اتر کر کسی ایک شخص کی رائے

[1] گو کہ خلفائے راشدین کے تعامل یا اُن کی اولیات سے اُن کا استدلال صحیح نہیں ہوتا، مگر وہ اس کی آڑ لینے کی کوشش کرتے ہیں،

کو اپنے استدلال کی بنیاد بنا کر کتاب وسنت کے کھلے ہوئے احکام اور پوری اُمت کے تعامل کو نظر انداز کر دینے میں ذرہ بھی وہ تامل نہیں کرتے، چنانچہ وہ کبھی حضرت عمرؓ کی اولیات کو بہانہ بناتے ہیں، کبھی شرح وقایہ کے کسی جزئیہ سے استدلال کرتے ہیں، کبھی علامہ شبلی اور ڈاکٹر اقبال کے اشعار سے استدلال کرتے ہیں، اور اُن کی رائے یا قرآن وسنت کے سلسلہ میں اُن کی تشریحات جس کا مفہوم وہ خود مقرر کرتے ہیں، کے مقابلہ میں پوری اُمت کے تعامل، اور اُسکی تشریحات کو نظر انداز کر دیتے ہیں، چنانچہ طلاق ثلاثہ کے سلسلہ میں بھی ان کا رویہ یہی ہے، تفویض طلاق کے سلسلہ میں انھوں نے شرح وقایہ کے ایک جزئیہ کو اپنے استدلال کی بنیاد بنائی مگر طلاق ثلاثہ کے سلسلہ میں حضورؐ کے واضح ارشادات صحابہ کے تعامل اور ائمہ اربعہ کے اتفاق سب کو نظر انداز کر کے اُمت کے دو چار علماء کی رائے کو انھوں نے ترجیح دینے کی کوشش کی ہے، حالانکہ ائمہ اربعہ کا اتفاق ہی اس کی ترجیح کے لئے کافی تھا۔

بہرنوع جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ عہد نبوی اور عہد صدیقی میں ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقیں ایک شمار ہوتی تھیں، ان کا استدلال دو روایتوں پر ہے،

پہلی روایت | پہلی روایت حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رکانہ کے والد عبد یزید نے اپنی عورت اُم رکانہ کو طلاق دیدی، اور ایک دوسری عورت سے شادی کر لی، مگر دوسری بیوی سے نباہ نہ ہو سکا، یہ معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا، آپ نے عبد یزید سے کہا کہ تم اپنی پہلی بیوی واپس بلا لو، انھوں نے کہا کہ میں نے اس کو تین طلاقیں دی ہیں، آپ نے فرمایا کہ مجھے اس کا علم ہے تم رجوع کر لو[1]

دوسری روایت میں، یورکانہ کے بجائے خود رکانہ کا واقعہ بیان ہوا ہے، اور اس میں لفظ ثلاث (تین) کے بجائے البتہ (قطعی) کا لفظ ہے، بحث آگے آتی ہے،

دوسری روایت | دوسری روایت طاؤس سے مروی ہے[2] کہ ایک شخص ابو صہبا حضرت ابن عباسؓ

[1] یہ روایت ابوداؤد نے نقل کی ہے، مگر یہی روایت دوسرے الفاظ میں بھی مروی ہے، اس کی تفصیل

سے بہت سوال کرتا تھا، اس نے ایک بار ابن عباسؓ سے کہا کہ آپ کو تو اس کا علم ہوگا کہ عہد نبوی، عہد صدیقی اور ابتدائے عہد فاروقی میں تین طلاقیں ایک ہی سمجھی جاتی تھیں، آپ نے کہا، ہاں ایسا ضرور تھا، مگر جب حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ لوگ اس معاملہ میں جلد بازی سے کام لینے لگے ہیں جس میں اُن کو صبر و تحمل سے کام لینا چاہئے تھا، تو انھوں نے حکم دیا کہ

اجیزوھن علیھم؎ — تین طلاقیں نافذ کردی جائیں،

ان روایات کی صحت و عدم صحت اور اُن کے مفہوم کے تعین پر محدثین نے جو بحثیں کی ہیں اُن کو ہم بعد میں پیش کریں گے، اس سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نفس مسئلہ کو قرآن، سنت، آثار صحابہ اور اُمت کے عام تعامل کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی جائے،

پہلی اور دوسری ہجری تک جب کہ ابھی طلاق اور رجعت کے احکام تفصیل سے نازل نہیں ہوئے تھے، تو اُس میں لوگ بڑی بے اعتدالی سے کام لیتے تھے، ایک آدمی جتنی طلاقیں چاہتا تھا، دیدیتا تھا، اور پھر جب عورت اس سے علٰحدہ ہو کر کسی اور سے اپنا بناؤ کرنا چاہتی تھی تو وہ رجوع کر لیا کرتا تھا، اس طرح زندگی میں سو بار بھی وہ طلاق دیتا، اور رجوع کر لیتا؎، اس کو غصہ آیا، اُس نے طلاق دیدی، غصہ فرو ہوا، رجوع کر لیا، چونکہ عورتوں کے لئے یہ صورت انتہائی تکلیف"

(بقیہ حاشیہ ص) آگے آئے گی، علامہ خطابی نے لکھا ہے،

فی اسناد ھذا الحدیث مقال لان ابن جریج انما رواہ عن بعض بنی ابی رافع ولم یسمہ والمجہول لا یقوم بہ الحجۃ، (ج ۳ ص ۲۳۶)

؎ اس روایت کے الفاظ میں بڑا اختلاف ہے، بحث آگے آئے گی، ابوداؤد اور مسلم وغیرہ میں یہ روایت انہی الفاظ میں درج ہے، ؎ جاہلیت میں اس پر کوئی پابندی نہیں تھی، اس لئے وہ عادتیں اب تک جاری تھیں،

تھی، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس طرح کے معاملے پیش ہوتے رہتے تھے تو آپ اس کے جواب میں ہمیشہ توقف فرماتے تھے، اس لئے کہ قرآن میں ابھی صراحۃً کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا، چنانچہ جب الطلاق مرتان کی آیت نازل ہوئی، تو آپ نے حکم دیدیا کہ ایک مرد زیادہ سے زیادہ تین طلاق دے سکتا ہے، حضرت عائشہؓ کی زبان سے اس حکم کے نزول کی تفصیل سُنیے حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ

"طلاق کا حکم نازل ہونے سے پہلے ایک آدمی جتنی طلاقیں چاہتا تھا، دے دیتا تھا، اور پھر عدت ختم ہونے سے پہلے رجوع کر لیتا تھا، یہاں تک کہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ میں نہ تجھ کو علٰحدہ کروں گا اور نہ اپنے قریب ہی آنے دوں گا، اس نے پوچھا یہ کیسے؟ اُس نے کہا کہ میں تجھ کو طلاق دوں گا، اور عدت پوری ہونے سے پہلے رجوع کروں گا، پھر اسی طرح طلاق دیتا اور رجوع کرتا رہوں گا، یہ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں آئی، اور اُس نے اپنی تکلیف بیان کی، حضرت عائشہؓ نے اس کا تذکرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا آپ اُسے سُن کر خاموش ہوگئے، اور اس وقت کوئی جواب نہیں دیا، اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی،

الطلاق مرتان فامساك بمعروف او تسریح باحسان؎ — طلاق دو بار ہے اس کے بعد یا تو بھلائی سے روک لینا چاہئے یا پھر خوش اسلوبی سے چھوڑ دینا چاہئے

اس کے بعد طلاق دینا اور رجوع کرنا کھیل نہیں رہا، بلکہ اب ایک آدمی ایک بار یا دو بار طلاق

؎ یہ روایت امام بیہقی نے سنن میں نقل کی ہے، اس روایت کو مرسلاً امام بخاری نے بھی اپنی صحیح میں درج کیا ہے،

دے کر یا تجدید نکاح کے بعد اس سے رجوع کر سکتا ہے، تیسری بار طلاق دینے کے بعد بیوی کو اپنے پاس رکھنے کا کوئی حق باقی نہیں رہتا، آپ نے لوگوں کی پچھلی ذہنیت کو بدلنے کے لئے بار بار اس سلسلے میں یہ ہدایت فرمائی کہ لوگ طلاق کو کھیل اور مذاق نہ بنائیں، بلکہ اس اجازت سے انتہائی مجبوری کی حالت میں فائدہ اٹھائیں، آپ نے بار بار فرمایا،

ابغض الحلال الی اللہ الطلاق	حلال چیزوں میں مبغوض ترین چیز خدا کے یہاں طلاق ہے،

آپ نے نکاح و طلاق کے بارے میں کبھی مذاق اور تفریح کی بھی اجازت نہیں دی یعنی اگر کوئی شخص مذاق سے بھی طلاق دے دے تو وہ مذاق بھی سنجیدگی پر محمول کیا جائے گا، آپ نے فرمایا!

ثلاث جدھن جد وھزلھن جد النکاح، الطلاق، والرجعة[1]	تین چیزوں کی سنجیدگی بھی سنجیدگی ہے اور مذاق بھی سنجیدگی ہے، نکاح، طلاق اور رجعة،

آپ نے اس بارے میں یہ بھی تاکید فرمائی کہ اگر کسی کو طلاق دینے کی ضرورت پیش آئے تو حالتِ حیض میں طلاق نہ دیجائے، بلکہ طہر یعنی پاکی کی حالت میں دی جائے، اور ایک ساتھ نہ دیجائے بلکہ ایک طلاق دے کر طلاق دینے والا ایک ماہ کا انتظار کرے، اگر اس درمیان میں اس کے تعلقات درست ہوگئے، تو رجوع کرلے، ورنہ پھر دوسرے مہینے طلاق دے، اس طرح اس کو اچھی طرح غور کرنے اور نادم ہونے کا موقع ملے گا، لیکن اگر اس نے طلاق کے لفظ کو بیجا استعمال کیا، یعنی اوس نے حالت حیض میں طلاق دیدی، یا ایک ہی وقت تینوں طلاقیں دے ڈالیں تو گو اس طرح طلاق دینا، کتاب و سنت کی وضاحت کے خلاف ہے مگر اس غلطی کی وجہ سے آدمی کو

[1] یہ روایت الخمسہ بخاری، مسلم، ابو داؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے نقل کی ہے،

اس کے اس بنیادی حق سے تو محروم نہیں کیا جا سکتا تھا، البتہ اس کو اس بات پر سزا دی جا سکتی ہے کہ اس نے غور و فکر اور ندامت کے موقع کو ضائع کر دیا، یہی بات ہے، جسے آپ نے اور صحابۂ کرامؓ نے اس طرح طلاق دینے والوں سے ہمیشہ فرمائی، مقصد یہ ہے کہ طلاق کے معاملہ کو ہر صورت میں سنجیدگی پر محمول کیا جائے گا، اس لئے جب اس نے تین طلاق اپنی زبان سے نکال دی تو اس کو نافذ ہی کیا جائے گا، لیکن چونکہ اپنے حق کے استعمال میں اس نے غلطی کی ہے اس لئے اس کو اس کے ساتھ گنہگار بھی قرار دیا جائے گا، اور سزا بھی دی جا سکتی ہے، جیسا کہ حضرت عمرؓ کرتے تھے[1]،

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب بھی اس طرح کے معاملات پیش آئے آپ نے ایک طرف تین طلاقیں نافذ کر دیں، اور دوسری طرف اس کو گناہ گار اور غلط کار بھی کہا،

حضرت محمود بن لبید سے مروی ہے کہ ایک شخص کے بارے میں آپ کو یہ اطلاع ملی کہ اس نے اپنی عورت کو تین طلاقیں ایک ساتھ دے دی ہیں، تو آپ غصہ میں کھڑے ہوگئے، اور فرمایا کہ میری موجودگی میں کتاب اللہ سے کھیل کیا جا رہا ہے[2]،

اس میں یہ ذکر نہیں ہے کہ آپ نے ان طلاقوں کو نافذ کیا یا نہیں، مگر اس روایت کے الفاظ یہ بتا رہے ہیں کہ آپ نے اس کو ضرور نافذ فرمایا جس کی تائید دوسری روایات سے بھی ہوتی ہے، ابوبکر ابن عربی اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

ولم یردہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم بل امضاہ،	آپ نے اسے رد نہیں کیا یعنی رجوع کا حکم نہیں دیا، بلکہ تینوں کو نافذ کر دیا

[1] فتح الباری ج ۹ ص ۳۱۵، [2] نسائی کتاب الطلاق، باب الثلاث المجموعة وما فیہ من التغلیظ اس روایت کی صحت میں گو کچھ کلام کیا گیا ہے، مگر اس کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے، مقصد یہ ہے کہ یہ طریقہ قرآن کے منشا کے خلاف ہے

حضرت ابن عمرؓ نے اپنی بیوی کو حالتِ حیض میں ایک طلاق دی، اور پھر خود ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا،

ماھکذا امرک اللہ اخطات السنۃ، — خدا نے تمھیں اس طرح طلاق دینے کا حکم نہیں دیا ہے، تم نے سنت کے خلاف

اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ رجوع کرلو، اور پھر طلاق دینا ہو تو دوسرے طہر میں طلاق دینا، ابن عمرؓ نے آپ سے پھر دریافت فرمایا کہ اگر میں نے ایک ساتھ تین طلاقیں دے دی ہوتیں تو کیا اس کے بعد بھی میں رجوع کرسکتا تھا، آپ نے فرمایا،

کانت تبین ذلک وکانت معصیۃ[۱] — تم رجوع نہیں کرسکتے تھے، اس کے بعد وہ تم سے بالکل جدا ہو جاتی اور تمھارے اوپر گناہ بھی ہوتا،

جس طرح ایک ساتھ تین طلاق دینا مناسب نہیں ہے، اسی طرح حیض کی حالت میں طلاق دینا بھی منع ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اوپر گذر چکا ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ خدا نے اس طرح طلاق دینے کا حکم نہیں دیا ہے، آپ کا اشارہ قرآن کی آیت

یاایھا النبی اذا طلقتم النساء فطلقوھن لعدتھن، — اے نبی جب تم عورتوں کو طلاق دو تو اُن کو پاکی کی حالت میں طلاق دو[۲]

جس طرح پہلے شخص کے بارے میں آپ نے غصہ کا اظہار فرمایا، اسی طرح اس کو غلط

[۱] طبرانی بیہقی وغیرہ نے اس روایت کو اسی تفصیل سے بیان کیا، مگر اس روایت کے ابتدائی حصہ کو دوسرے ائمہ حدیث بخاری، ابوداؤد، ترمذی وغیرہ نے نقل نہیں کیا ہے،
[۲] تفصیل تفسیر طبری میں دیکھی جاسکتی ہے،

کہا اور غصہ کا اظہار فرمایا[۱]، اس کے باوجود آپ نے اس طلاق کو بالکل رد نہیں فرمایا، اس پر بعض لوگوں کو تعجب بھی ہوا، اور انھوں نے ابن عمرؓ سے دریافت کیا کہ کیا آپ اس طلاق کو طلاق سمجھتے ہیں، انھوں نے کہا خاموش رہو، میری غلطی اور حماقت کی وجہ سے یہ طلاق شمار نہ کیجائے گی[۲]،

اس روایت سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اگر طلاق صحیح طریقہ پر نہ بھی دیجائے، تو وہ طلاق پڑجاتی ہے، البتہ اس غلطی کی وجہ سے اس فعل کو معصیت کہا جائے گا، پھر اس روایت کے آخری الفاظ پر غور کیا جائے تو اس سے پہلی روایت کی وضاحت ہوجاتی ہے، یعنی ابن عمرؓ کے پوچھنے پر آپ نے فرمایا کہ اگر تم اس حالت میں تین طلاقیں دیدیتے تو تمھاری بی بی تم سے علحدہ بھی کردیجاتی، اور تم گنہ گار بھی ہوتے، یعنی یکبارگی تین طلاق دینے کے بعد بیوی علحدہ تو ہو جائے گی، اگرچہ کہ یہ طریقہ غلط ہے، اسی لئے آپ نے اس پر غصہ کا اظہار فرمایا، اس کو خلاف سنت کہا، اور معصیت بتایا، تاکہ لوگ آیندہ اپنے حق کا استعمال صحیح طور پر کریں،

تیسری روایت اور ملاحظہ ہو، سہل بن سعد سے روایت ہے کہ ایک شخص عویمر کو اپنی بیوی پر شبہہ ہوا، انھوں نے آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوکر پوچھا کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے پاس کسی مرد کو دیکھے تو اسکو قتل کردے یا کیا کرے؟ آپ نے فرمایا اس بارے میں خدا کا حکم نازل ہوچکا ہے، جاؤ اپنی بیوی کو لے کر آؤ، تو آپ نے ان دونوں کو لعان کا حکم دیا، انھوں نے لعان کیا[۳] اس کے بعد عویمر

[۱] دارقطنی میں ہے فتغیظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم [۲] بخاری کتاب الطلاق اصل میں الفاظ فان عجز واستحمق آئے ہیں، اس کے دو معنی بیان کیے گئے ہیں، ایک تو جو اوپر بیان کیا گیا ہے، دوسرا مطلب یہ ہے کہ طلاق کے علاوہ بھی کوئی چارہ کار ہے، اس وقت یہ جملہ انکاریہ ہوگا، (فتح الباری)
[۳] لعان کا طریقہ سورۂ نور میں مذکور ہے۔

کہا کہ اب میں جھوٹا ٹھہروں گا، اگر اس کو بیوی بنائے رکھوں، چنانچہ انھوں نے آنحضرت صلعم کے ارشاد سے پہلے ہی تین طلاقیں دیدیں[1]، اس روایت سے معلوم ہوا کہ عویمر نے آپ کی موجودگی میں تین طلاقیں دیں، اور آپ نے اُن کو نافذ کر دیا، یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ لعان میں تفریق حاکم ہی کے ذریعہ ہوتی ہے، اور یہ فرض آپ نے خود انجام دیا،

اس سلسلہ میں ایک روایت اور ملاحظہ ہو، عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ان کے دادا نے اپنی بیوی کو ایک ہزار طلاقیں دیں، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا، تو آپ نے فرمایا کہ تمھارے دادا نے خدا کا خوف نہیں کیا، محض تین طلاقوں کا ان کو حق تھا، بقیہ ۹۹۷ طلاقیں ظلم و زیادتی ہے، خدا چاہے گا، تو معاف کر دے گا، اور اگر چاہے گا، تو عذاب دے گا،

اس روایت پر شوکانی نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اس میں اُن کے باپ یا دادا کے طلاق کا ذکر ہے، اور ان میں سے کسی نے اسلام کا زمانہ نہیں پایا، اس لئے ان کے بارے میں سوال کے کیا معنی، مگر یہی روایت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے دارقطنی اور مجمع الزوائد میں ان الفاظ کے ساتھ روایت ہوئی ہے کہ میرے بعض بزرگوں میں سے کسی نے اپنی بیوی کو ایک ہزار طلاق دی، اور ان کے لڑکوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا، تو آپ نے فرمایا،

بانت منه بثلاث علی — تین طلاق سے عورت اس سے جدا

---

[1] ابوداؤد اور نسائی میں ان الفاظ کے ساتھ یہ روایت آئی ہے، امام احمد کی روایت میں کذبت کے بجائے ظلمت کا لفظ ہے، اور تین طلاق کے بجائے تین بار لفظ طلاق دہرایا ہے،

[2] یہ روایت شوکانی نے مصنف عبد الرزاق کے حوالہ سے نقل کی ہے، اور یہ دارقطنی اور مجمع الزوائد میں بھی ہے،

غیر السنة، ہو گئی، اگرچہ یہ سنت کے خلاف ہے،

گو دونوں روایتوں پر محدثین نے کلام کیا ہے، لیکن اوپر کی احادیث کی روشنی میں اُس کو دیکھا جائے، تو یہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے،

ایک اور روایت حضرت حسن سے مروی ہے، انھوں نے بیان کیا کہ میں نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدیں، بیوی کو اس کا بڑا رنج ہوا، اس کی اطلاع اُن کو ہوئی تو اُن کو بھی رنج ہوا، اور انھوں نے کہا کہ اگر میں نے قطعی طلاق نہ دے دی ہوتی، تو رجعت کر لیتا، مگر اب مجبوری ہے، اس لئے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جو تین طلاقیں تین طہر میں دے، یا تین مہینے میں دے، یا ایک ساتھ تین طلاقیں دے تو وہ عورت حرام ہو جاتی ہے، اب بغیر نکاح ثانی وہ میرے ساتھ نہیں رہ سکتی[1]،

اسی طرح حفص بن عمر رضی اللہ عنہ اور عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی مذکور ہے، کہ ان لوگوں نے ایک مجلس میں تین طلاقیں دیں، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوئی، مگر آپ نے اسے ایک نہیں قرار دیا[2]،

---

[1] یہ روایت دارقطنی میں دو واسطوں سے مروی ہے، دونوں میں ایک ایک راوی کو بعض محدثین نے ضعیف کہا ہے، اور ان پر شیعیت کا الزام لگایا ہے، مگر اس کے باوجود ابن معین اور ابوداؤد نے ایک کی روایت کو قبول کیا ہے، اس لئے یہ روایت ضعیف ہونے کے باوجود اپنے متن کے اعتبار سے رد کر دینے کے قابل نہیں ہے، [2] یہ دونوں روایتیں دارقطنی میں ہیں، اُن کی صحت میں کوئی کلام نہیں ہے، البتہ بعض روایتوں میں یہ ہے کہ حفص بن عمرو نے تین طلاقیں جدا جدا دیں، اور ابن عوف نے البتہ کا لفظ استعمال کیا، یعنی قطعی طلاق یا بالکل طلاق کا لفظ استعمال کیا،

ان تمام روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حیض میں یا ایک مجلس میں یا ایک طہر میں دی گئی تین طلاقوں کے بارے میں ہمیشہ آپ نے مرد عورت کے درمیان جُدائی کا فیصلہ فرمایا،

ان ارشاداتِ نبوی کے بعد اب ممتاز صحابہ کے آثار و فتاویٰ پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے،

مدینہ میں ایک پرمذاق آدمی تھا، اُس نے اپنی بیوی کو ایک بار ایک ہزار طلاقیں دیں[1] یہ معاملہ حضرت عمرؓ کے سامنے پیش ہوا، تو اُس نے کہا کہ میں نے مذاقاً اتنی طلاقیں دی ہیں حضرت عمرؓ نے اپنا کوڑا سنبھالا، اور کہا کہ تمھارے لئے بس تین طلاقیں کافی ہیں[2]

حضرت عثمانؓ سے مروی ہے کہ اُن کے سامنے ایک شخص آیا، اور اُس نے کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو ایک ہزار طلاق دے دی ہے، آپ نے فرمایا،

بانت منک بثلاث	تین ہی سے تمھاری عورت تم سے جُدا ہوگئی،

حضرت علیؓ کے پاس بھی ایک ایسا ہی شخص آیا، اور اُس نے کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو ایک ہزار طلاق دیدی ہے، انھوں نے کہا کہ تین ہی طلاق نے تمھارے اوپر تمھاری بیوی کو حرام کردیا، بقیہ طلاقوں کو دوسری بیویوں میں تقسیم کردو[3]

حضرت علیؓ کے اس فتوے کے بارے میں ممتاز تابعی، امام اعمش بیان کرتے ہیں، کہ کوفہ میں ایک شیخ حدیث سے میں نے سنا کہ وہ حضرت علیؓ کے بارے میں یہ بیان کر رہے تھے کہ میں نے اُن سے سُنا ہے کہ جو ایک مجلس میں تین طلاق دے وہ ایک شمار ہوگی، کوفہ میں یہ نیا فتویٰ تھا، اس لئے لوگ جوق در جوق یہ روایت سننے کے لئے اُن کے پاس آنے لگے، میں بھی ایک دن

[1] سنن بیہقی جلد، ص ۳۳۴، ابن حزم جن کا مسلک اس کے خلاف ہے، انھوں نے بھی یہ روایت نقل کی ہے، [2] بیہقی جلد، ص ۳۳۵-

اُن کے پاس پہنچا، اور اُن سے کہا کہ آپ نے کس طرح سنا ہے کہ حضرت علیؓ ایک ہی وقت میں دی گئی تین طلاقوں کو ایک سمجھتے تھے، انھوں نے وہ روایت بیان کی، میں نے اُن سے پوچھا کہ آپ کو یہ روایت کیسے پہونچی ہے، انھوں نے کہا کہ میرے پاس یہ روایت لکھی ہوئی موجود ہے، چنانچہ انھوں نے وہ تحریر پیش کی، امام اعمش کہتے ہیں کہ میں نے اس کو پڑھا تو اس میں یہ تحریر تھا،

هذا ما سمعت علی بن ابی طالب رضی الله عنه یقول اذا طلق امرأته ثلاثا فی مجلس واحد فقد بانت ولا تحل له حتی تنکح زوجا غیره[1]	یہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سنا ہے کہ فرماتے تھے کہ جب کوئی شخص ایک مجلس میں تین طلاق دیدے تو وہ عورت بائن ہوگئی، اور جب تک وہ حلالہ نہ کرے، اسی وقت تک وہ اس کے لئے حلال نہیں ہوسکتی،

امام اعمش کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ افسوس ہے کہ یہ تو بالکل اس کے خلاف ہے، جو آپ بیان کر رہے ہیں، انھوں نے کہا صحیح تو یہی ہے جو اس میں لکھا ہے مگر مجھے کچھ لوگوں نے یہ روایت اس طرح بیان کرنے پر آمادہ کیا[2]، حضرت علیؓ کے فتاوے عام طور پر کوفہ میں معروف و مشہور تھے، اس لئے لوگوں کو تعجب ہوا اور لوگ جوق در جوق یہ نئی روایت سننے کے لئے دوڑنے لگے...... امام اعمش نے ان لوگوں کا نام تو نہیں بتایا، کہ کن لوگوں نے اُن کو اس پر آمادہ کیا تھا[3]، قیاس یہی ہے کہ حضرت علیؓ کے مخالفین نے ایسا کرایا ہوگا،

[1] سنن بیہقی ج، ص ۳۳۹ - ۳۴۰ [2] اس روایت پر کوئی کلام نہیں کیا گیا ہے، مگر اس میں دونوں پہلوؤں کا امکان ہے یعنی حضرت علیؓ کی مخالفت کیا تھا امام اعمش کو مطعون کرنا بھی مقصود ہو،

حضرت ابن مسعودؓ کے پاس ایک شخص آیا، اس نے کہا کہ میں نے گذشتہ رات اپنی بیوی کو سو طلاقیں دیدی ہیں، آپ نے پوچھا کہ یکبارگی اس نے کہا ہاں! آپ نے پھر اس سے سوال کیا کہ تم اس کو اپنے سے جدا بھی کرنا چاہتے ہو، اس نے کہا ہاں، آپ نے کہا کہ تمھارا جو ارادہ ہے وہ پورا ہوگیا یعنی تمھاری عورت تم پر حرام ہوگئی، اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ خدا نے طلاق کے لئے واضح حکم دے دیا، تو جو لوگ اپنے اوپر بوجھ لادنا ہی چاہتے ہیں، ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ ہم ان کا بوجھ ہلکا کرتے پھریں، تم لوگ جیسا کچھ کہو گے ویسا ہی حکم لگایا جائے گا۔[1]

حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ اے معاذ! جو شخص غیر مسنون طریقہ پر دو یا تین طلاق دیدے ہم اس کی اس بدعت کو نافذ کر دیں گے۔[2]

حضرت ابن عمرؓ کا واقعہ اوپر گذر چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے انھوں نے پوچھا کہ اگر میں حیض کی حالت میں تین طلاق دیدیتا تو وہ پڑجاتیں، آپ نے فرمایا تین طلاق بھی پڑجاتی، اور تم گنہگار بھی ہوتے، اب ان کا فتوی بھی سنئے،

نافع بیان کرتے ہیں، کہ حضرت ابن عمرؓ اس شخص کے بارے میں جو ایک ساتھ تین طلاق دیدے یہ کہا کرتے تھے کہ

بانت منه امرأته وعصى ربه تعالى وخالف السنة[3]

اس کی عورت تو اس سے جدا ہوگئی مگر اس نے یہ طریقہ اختیار کرکے خدا کی معصیت کی اور سنت نبوی کی مخالفت کی

---

[1] بیہقی ج ۷، ص ۳۳۵ [2] دارقطنی ص ۴۳۳، کتاب الطلاق میں اس روایت کے ایک راوی اسماعیل بن امیہ کو محدثین نے ضعیف کہا ہے، مگر دوسری روایات کی متابعت کی وجہ سے اس کا ضعف دور ہوجاتا ہے، [3] دارقطنی،

حضرت ابن عمرؓ کو آنحضرتؐ نے رجعت کا جو حکم دیا تھا، اس سے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی تھی کہ جتنی طلاق بھی غلط طریقہ پر دے دی جائے گی، اس کے بعد بھی رجعت کیجاسکتی ہے، چنانچہ حضرت عمرؓ کے پاس ایک شخص آیا، اور اس نے کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں یکبارگی تین طلاقیں دے دی ہیں، آپ نے فرمایا تم نے اپنی بیوی کو جدا کردیا، اس نے کہا کہ اسی طرح ابن عمرؓ نے بھی اپنی بیوی کو طلاق دے دیا تھا، مگر آنحضرت نے ان کو رجعت کا حکم دیا، آپ نے فرمایا، ہاں انھوں نے رجعت کی گنجائش رکھی تھی، اس لئے آپ نے ایسا حکم دیا تھا، مگر تم نے کوئی گنجائش باقی نہیں رکھی،[1]

اسی طرح حضرت عائشہؓ اور حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابن زبیرؓ نے متفقہ طور پر مدخول بہا کے بارے میں یہ فیصلہ کیا کہ اس کو تینوں طلاقیں پڑجائیں گی، بیہقی اور موطا امام مالک میں ان کے فتاوے موجود ہیں، گو یہ فتوے غیر مدخول بہا کے بارے میں ہیں، اور یہاں بحث مدخول بہا کی ہے، مگر اس سے یہ تو اندازہ ہو ہی جاتا ہے، کہ یکبارگی تین طلاقیں نافذ کردینے کا فتوی ان بزرگوں نے دیا ہے،

اسی طرح عمران بن حصینؓ اور حضرت انسؓ، اور زید بن ثابتؓ سے بھی ثابت ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کو انھوں نے تین ہی قرار دیا ہے،[2] عمران بن حصین کے فتوی کے الفاظ بیہقی میں یہ ہیں،

---

[1] بیہقی ج ۷، ص ۳۳۴ [2] ابن حصینؓ کی روایت بیہقی نے (ج ۷، ص ۳۳۲) میں نقل کی ہے، اور حضرت انسؓ کی روایت معانی الآثار میں ہے، ابن ہمام نے فتح القدیر میں اس کو نقل کیا ہے، اور زیدؓ بن ثابت کے بارے میں بھی صاحب فتح القدیر نے نقل کیا ہے کہ وہ اس کے قائل تھے،

اثم بربہ وحرمت علیہ امرأتہ — اس نے خدا کی نافرمانی کی، اور اس کی بیوی اس پر حرام ہوگئی۔

جس کے بارے میں یہ فتویٰ دیا گیا تھا وہ ابو موسیٰ اشعریؓ کے پاس پہنچا، اور اس نے ان سے کہا کہ ابن حصینؓ تو یہ فتویٰ دیتے ہیں، کیا یہ صحیح ہے؟ ابو موسیٰ نے کہا، خدا ابن حصین جیسا آدمی کثرت سے پیدا کرے۔

اب اس سلسلہ میں حضرت ابن عباسؓ (جن کی روایت پر دوسرے لوگوں کے استدلال کی بنیاد ہے) کے ان اقوال اور فتاویٰ کو دیکھیے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقوں کو تین ہی شمار کرتے تھے۔

مجاہد سے روایت ہے کہ میں ابن عباسؓ کی خدمت میں موجود تھا، کہ ایک شخص آیا، اور اس نے کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی ہیں، یہ سن کر وہ کچھ دیر خاموش رہے، ان کی خاموشی سے مجھے گمان ہوا کہ وہ اس طلاق کو رجعی قرار دیں گے، مگر انھوں نے فرمایا کہ لوگ حماقت کر بیٹھتے ہیں پھر یہاں آکر اے ابن عباس! اے ابن عباس! پکارتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جو اس سے ڈرتا ہے، وہ اس کے لئے راہ پیدا کردیتا ہے، تم اس سے ڈرتے نہیں، اس لئے میں تمھارے لئے کوئی راہ نہیں پا رہا ہوں، تم نے خدا کی نافرمانی کی، اور تمھاری بیوی تم سے جدا ہوگئی،

ابوداؤد نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ مجاہد سے یہ روایت دوسرے سلسلۂ سند سے بھی ثابت ہے، ان کے متعدد شاگردوں کا نام لیا ہے جنھوں نے ان سے ایک مجلس کی تین طلاقوں کو تین ہی نافذ کرنے کے فیصلہ کو نقل کیا ہے، مثلاً عکرمہ، سعید بن جبیر، عطاء، مالک بن حارث، عمرو بن دینار، اس کے بعد لکھا ہے کہ

۵۱ ابوداؤد کتاب الطلاق،

کلھم قالوا فی الطلاق الثلاث انہ اجازھا وقال وبانت منک، — ان میں سے ہر ایک نے یہی کہا ہے کہ ابن عباسؓ کے سامنے جب یہ مسئلہ آیا تو انھوں نے تینوں طلاقیں نافذ کردیں، اور سائل کو جواب دیا کہ تمھاری بیوی تم سے الگ ہوگئی۔

دار قطنی اور بیہقی نے ان میں سے ہر ایک کی روایت کو الگ الگ نقل کردیا ہے، بیہقی کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ کے ذی شان جلیل القدر شاگرد یعنی سعید بن جبیر، عطاء بن ابی رباح، مجاہد، عکرمہ، عمرو بن دینار، مالک بن حارث، محمد بن ایاس، معاویہ بن ابی عیاش، ان تمام لوگوں نے ان سے روایت کی ہے کہ

انہ اجاز الطلاق الثلاث وامضاھن، — ابن عباسؓ نے ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقوں کو ۔ ۔ ۔ جائز رکھا، نافذ کیا،[۵۲]

امام مالک نے موطا میں نقل کیا ہے کہ ابن عباسؓ سے ایک شخص نے کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دیدی ہیں، انھوں نے کہا کہ تین ہی سے تمھاری بیوی مطلقہ ہوگئی، بقیہ ۹۷ طلاقوں کے ذریعہ تم نے اللہ کی آیات کیساتھ استہزاء کیا ہے جو تمھارے لئے قیامت میں وزر ہوں گی۔[۵۳]

حضرت ابن عباسؓ کے شاگرد مالک بن حارث روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص ابن عباسؓ کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ میرے چچا نے ایک ساتھ تین طلاقیں دیدی ہیں، انھوں نے فرمایا کہ

۵۲ و ۵۳ دار قطنی نے بھی اس روایت کو الفاظ کے تھوڑے اختلاف کے ساتھ نقل کیا ہے، آخری جملہ دار قطنی ہی کا ہے،

تمہارے چچا نے خدا کی نافرمانی کی، اس لئے خدا نے اسے شرمندہ کیا، اور اس کے لئے راہ نہیں پیدا کی[1]۔

عمرو بن دینار سے مروی ہے کہ ابن عباسؓ سے ایک ایسے شخص کے بارے میں سوال کیا گیا، جس نے آسمان کے تاروں کے بقدر طلاق دیدی تھی، انھوں نے وہی جواب دیا، جو اوپر دے چکے ہیں،

حضرت ابن عباسؓ کے شاگردوں میں صرف ایک شاگرد طاؤس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ تین طلاق کو ایک سمجھتے تھے، اور ابن عباسؓ سے بھی روایت کرتے تھے، جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے، مگر طاؤس کے بارے میں علی ابن المدینی امام جرح و تعدیل نے معمر اور ابن طاؤس کے واسطہ سے نقل کیا ہے کہ ابن طاؤس کہتے تھے، کہ

"جو شخص یہ بیان کرے کہ طاؤس ایک ساتھ دی گئی تین طلاقوں کو ایک سمجھتے تھے، وہ جھوٹا ہے[2]"

اور جن صحابہ کے فتاوے نقل کئے گئے ہیں ان میں سے ہر ایک صاحب افتا و قضا سمجھا جاتا ہے، اور ان ہی کے فتاوی پر پوری جماعت صحابہ اور اس کے بعد پوری امت کا تعامل ہے، اور اسلامی فقہ کی بنیاد کتاب و سنت کے نصوص کے بعد ان ہی کے فتاوی و اجتہادات پر ہے،

اب اس کے بعد تابعین، تبع تابعین، ائمہ اربعہ کے فتاوی اور جمہور امت کی رائیں ملاحظہ ہوں، اوپر متعدد تابعین کی روایتیں گذر چکی ہیں، جنھوں نے اس بارے میں عام صحابہ کے فتوے نقل کئے ہیں، ظاہر ہے کہ وہی رائے ان کی بھی تھی، جو انھوں نے اپنے اپنے استاذ صحابی سے نقل کی ہے،

[1] یہ روایت ابن ترکمانی نے الجوہر النقی میں مصنف ابن ابی شیبہ سے نقل کیا ہے،
[2] علامہ زاہد الکوثری نے لکھا ہے کہ یہ روایت حسین بن علی نے اب الاقتضاء میں نقل کیا ہے نیز اعلاء السنن ج ۱۱ ص ۵۰۲ میں بھی درج ہے،

امام محمد آثار میں نقل کرتے ہیں کہ ابراہیم نخعی اس شخص کے بارے میں جو ایک طلاق دے، اور نیت تین کی کرے، یا تین دے اور نیت ایک کی کرے، فرماتے تھے کہ اگر اپنی زبان سے ایک کہا ہے تو ایک طلاق سمجھی جائے گی، اور اگر تین کہا ہے تو تین شمار ہوگی، اور یہاں نیت کا کوئی سوال نہیں ہے،

قیس بن ابی عاصم جو خود تابعی ہیں، وہ ممتاز تابعی مغیرہ بن شعبہ کے بارے میں روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے میری موجودگی میں ان سے پوچھا کہ ایک شخص نے سو طلاقیں دیدی ہیں، اس کے بارے میں کیا خیال ہے، بولے تین ہی طلاق نے، اس کی بیوی اس پر حرام کردی، اور بقیہ ۹۷ بیکار ہوئیں[1]۔

اسی طرح نافع، محمد بن سیرین، مسروق کے بارے میں صراحت ہے کہ وہ یہی فتوی دیتے تھے۔ ابن رجب جنھوں نے اس مسئلہ پر مستقل ایک رسالہ لکھا ہے وہ صحابہ و تابعین کے بارے میں لکھتے ہیں:-

لم یثبت عن احد من الصحابۃ ولا من التابعین ولا من ائمۃ السلف المعتد بقولھم فی الفتاوی فی الحلال والحرام شیء صریح فی ان الطلاق الثلاث بعد الدخول یحسب واحدۃ اذا سبق	جن صحابہ، تابعین، اور ائمہ سلف کے فتاوی حلال و حرام کے سلسلہ میں معتبر سمجھے جاتے ہیں، ان میں سے ایک شخص سے بھی صراحۃً یہ ثابت نہیں ہے، کہ مدخولہا عورت کو یکبارگی کوئی تین طلاق دیدے تو اس کو انھوں نے ایک شمار

[1] اعلاء السنن ج ۱۱ ص ۵۱۲ بحوالہ بیہقی،

بلفظٍ واحدٍ[1]، کیا ہو،

شیخ ابن ہمام فتح القدیر میں لکھتے ہیں،

"مجتہدین صحابہ کی تعداد بیس سے زیادہ نہیں ہے، ان کے علاوہ بہت تھوڑے ہیں، اور تمام صحابہ انھی کے فتاوی پر عمل کرتے تھے، اور انھی سے فتوی لیتے تھے، مثلاً خلفائے اربعہ، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمرو بن العاص، زید بن ثابت، معاذ بن جبل، عائشہ، انس بن مالک، ابوہریرہؓ وغیرہ ان میں سے اکثر کے فتاوی ہم نے نقل کر دیے ہیں، کہ وہ نہایت واضح طور پر ایک مجلس کی تین طلاقوں کو نافذ کرتے تھے، اور صحابہ میں ان کا ایک بھی مخالف نظر نہیں آتا،[2]

اس سلسلہ میں ائمہ اربعہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر عدد کی تصریح کے ساتھ اس نے تین طلاقیں دی ہیں، تو عورت خواہ مدخولہ ہو یا غیر مدخولہ اس کو تین طلاقیں پڑ جائیں گی، ... ... البتہ اگر محض لفظ طلاق کی تکرار کی ہے، تو اس میں ائمہ کے درمیان تھوڑا سا اختلاف ہے،

ابن ہبیرہ لکھتے ہیں :-

واتفقوا الائمة الاربعة على	ائمہ اربعہ اس بات پر متفق ہیں، کہ اگر
ان الطلاق الثلاث بكلمة	تین طلاق عدد کی تصریح کے ساتھ یا
واحدة او بكلمات فی حالة	ایک ہی حالت میں یا ایک طہر میں تین
واحدة او فی طهر واحد	طلاقیں دی جائیں تو پڑ جائیں گی، اس میں

[1] کتاب الطلاق، [2] ایضاً

يقع ولم يختلفوا فی ذالك[1]،	کسی کا اختلاف نہیں ہے.

البتہ اس بارے میں ان ائمہ کی رائیں مختلف ہیں کہ یہ طلاق طلاق سنت سمجھی جائے یا طلاق بدعت، امام ابوحنیفہ اور امام مالک اس کو طلاق بدعت کہتے ہیں، اور امام شافعی اور امام احمد اُسے بھی طلاق سنت کہتے ہیں، جو ائمہ اس کو طلاق بدعت کہتے ہیں، ان کے پیش نظر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد ہے، جس میں آپ نے اُس کو خلاف سُنت اور معصیت قرار دیا ہے، اور پھر یہ چیز بھی اُن کے پیش نظر ہے، کہ اس نفاذ سے طلاق کا وہ اصل طریقہ لوگوں کے ذہن سے محو نہ ہونے پائے، جس کی صراحت کتاب و سنت میں ہے،

اور جو ائمہ اُس سنت قرار دیتے ہیں، اُن کے پیش نظر غالباً یہ بات ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو نافذ کر دیا، تو اس کو بھی سنت ہی کہنا چاہئے، البتہ دونوں سنتوں میں فرق کیا جائے گا،[2]

اسی طرح غیر مدخول بہا کے بارے میں ابن ہبیرہؒ لکھتے ہیں،

واتفقوا على انه قال الزوج	اس بارے میں بھی ائمہ اربعہ کا اتفاق
بغير المدخول بها انت طالق	ہے کہ اگر شوہر اپنی غیر مدخولہ بیوی
ثلاثا طلقت ثلاثا،	سے یہ کہے کہ تجھ کو تین طلاق ہے، تو تینوں
(الافصاح)	طلاق پڑ جائے گی،

اگر اُس نے اپنی ایسی بیوی کے سامنے محض تین طلاق کا لفظ دہرایا ہے، مثلاً یوں کہا کہ طلاق طلاق طلاق تو امام مالک یہ کہتے ہیں کہ اس میں اس کی نیت دریافت کی جائے گی، اگر

[1] افصاح ص ۲۹۵ - [2] امام شعرانی نے اس کو اشخاص اور حالات کے اختلاف پر محمول کیا ہے،

تاکید مقصود تھی، تو ایک ورنہ تین طلاقیں پڑجائیں گی، اور ائمہ ثلاثہ یہ کہتے ہیں کہ جس سے اُس نے مُباشرت نہیں کی وہ ایک ہی طلاق کے بعد بائن ہوجائے گی، اس کے بعد اس کو طلاق دینے کا اختیار باقی ہی نہیں رہا،

غرض یہ ہے کہ اس بارے میں ان ائمہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ایک مجلس میں یا ایک حالت میں دی گئی تین طلاقیں پڑجاتی ہیں،

حافظ ابن قیم نے اثرم تلمیذ امام احمد کا قول نقل کیا ہے، کہ وہ طلاق ثلثہ کو ایک سمجھتے تھے، مگر حنبلی مسلک کی مشہور کتابیں خرقی، مقنع، محرر وغیرہ میں یہ تصریح ہے کہ اثرم نے امام احمد سے پوچھا کہ ابن عباسؓ کی اس روایت کو آپ کس بنا پر چھوڑتے ہیں، انھوں نے فرمایا کہ

بروایۃ الناس عن ابن عباس — لوگوں کی کثرت سے روایتیں کہ ابن
انھا ثلاث — عباس تین طلاقوں کو تین سمجھتے تھے،

قاضی ابویعلیٰ حنبلی نے امام احمد کا وہ خط طبقات الحنابلہ میں نقل کیا ہے جو انھوں نے مسدد بن مسرہد کو لکھا تھا، اس میں ہے کہ

ومن طلق ثلاثاً فی لفظ واحدٍ — جس نے ایک مجلس میں ایک لفظ کے
فقد جھل وحرمت علیہ زوجتہ — ساتھ تین طلاقیں دیں، یعنی یہ کہا کہ
ولا تحل لہ ابداً حتی تنکح زوجاً — میں نے تین طلاق دی تو اس نے نادانی کا
غیرہ، — کام کیا اور اس کی بیوی اس پر حرام
(طبقات، ص ۵۲) — ہوجائے گی، یہاں تک کہ وہ حلالہ نہ کرائے

اب ایک طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد فیصلے، مجتہدین صحابہ کے فتوے، تابعین اور ائمۂ اربعہ کے مسالک اور جمہور امت کا ان پر تعامل ہے، دوسری طرف دو دلیلیں ملاحظہ ہوں،

جن کی بنا پر یہ کہا جاتا ہے کہ طلاق ثلاثہ کا نفاذ تو حضرت عمرؓ کی بدعت ہے، ورنہ عہد نبوی، اور عہد صدیقی میں تو ایک مجلس میں ایک حالت میں دی گئی تین طلاقوں کو ہمیشہ ایک ہی کہا جاتا تھا،

اوپر ہم دونوں روایتیں نقل کرچکے ہیں، اب ان دونوں پر ذرا تفصیل سے کلام کیا جاتا ہے،

پہلی روایت | پہلی روایت حضرت رکانہؓ سے مروی ہے جس کی سند، متن، اور صاحب واقعہ سب میں اختلاف ہے، اوپر جو روایت ابوداؤد سے نقل کی گئی ہے، اس میں یہ واقعہ رکانہ کے بجائے رکانہ کے والد عبد یزید کا بتایا گیا ہے، اور دوسری روایات میں یہ رکانہ کا واقعہ مذکور ہے، اس طرح کسی روایت میں لفظ البتۃ (قطعی) آیا ہے، اور کسی میں ثلاث (تین) کا لفظ آیا ہے،

امام احمد جنھوں نے اس روایت کو سب سے پہلے اپنی مسند میں جگہ دی ہے انھوں نے اس کے بارے میں یہ رائے دی ہے کہ

ان طرقہ ضعیفۃ — اس روایت کے تمام طرق یعنی سلسلۂ سند
(معالم السنن جلد ۲ صفحہ ۲۳۶) — کمزور ہیں،

امام منذری کہتے ہیں کہ امام بخاری کی بھی یہی رائے ہے

وضعفہ البخاری وقد وقع — اس کو امام بخاری نے بھی ضعیف کہا،[1]
الاضطراب فی اسنادہ — اور اس روایت کی سند اور متن دونوں
ومتنہ،[2] — میں اضطراب ہے،[2]

---

[1] تحفۃ الاحوذی ج ۲، ص ۲۱۰،

[2] متن کے اعتبار سے محدثین مضطرب اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں راوی نفس مضمون کے بارے میں کبھی کچھ کہتا ہو، اور کبھی کچھ، اور سند کے اعتبار سے اضطراب یہ ہے کہ ایک راوی کچھ کہے اور دوسرا کچھ اور تیسرا کچھ،

ابوداؤد نے اس روایت کے جتنے طریقے ہیں، سب کو نقل کیا ہے یعنی جس میں ان کے والد کا واقعہ بیان کیا گیا ہے، اور جس میں خود ان کا واقعہ بیان کیا گیا ہے، جس روایت میں اس کو رکانہ کا واقعہ طلاق بیان کیا گیا ہو اس کے ایک سلسلہ میں تو تین کا لفظ ہے، اور دوسرے سلسلۂ میں البتہ کا، گو اس میں سے ہر ایک سلسلۂ سند کو ضعیف کہا گیا ہے، مگر اس کے باوجود جس روایت میں البتہ کا لفظ ہے، اس کو ابوداؤد نے دوسرے سلسلۂ سند کے مقابلہ میں ترجیح دی ہے، کیونکہ اس سلسلہ کے راویوں میں اُن کے خاندان کے افراد زیادہ ہیں، اس لئے ان کا بیان دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ وقیع سمجھا جائے گا، لکھتے ہیں،

وهذا اصح من حديث ابن جريج ان ركانة طلق امراته ثلاثاً لانهم اهل بيته وهم اعلم به،	ان کے اہلِ خاندان کا بیان ابنِ جریج کی اس روایت سے زیادہ صحیح ہے، جس میں یہ ذکر ہے کہ رکانہ نے تین طلاقیں دیں، اس لئے کہ وہ اُن کے اہلِ بیت ہیں، اور وہ اس واقعہ کا ان سے زیادہ

ابوداؤد نے اپنی اس رائے کا اظہار بار بار کیا ہے جس روایت میں تین کا لفظ ہے، اس کو روایت کرنے کے بعد بھی یہی لکھتے ہیں کہ "ان کے گھر والوں کا بیان زیادہ صحیح ہے" اس کے علاوہ جن محدثین نے رکانہ کی حدیث نقل کی ہے، ان میں زیادہ تر البتہ کا لفظ ہے، مثلاً ترمذی، دارقطنی، امام شافعی وغیرہ، ابوداؤد کی اس معقول محدثانہ رائے کے بعد اس روایت کے سلسلہ میں کسی مزید بحث کی گنجائش باقی نہیں رہتی، کیونکہ البتہ کا لفظ مجمل ہے، جس میں کہنے والے کی نیت دریافت کی جائے گی، اور اسی پر فیصلہ کیا جائے گا،

(باقی)

امام دارمیؒ اور اُن کی سُنن

از

مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی رفیق دارالمصنفین،

امام دارمیؒ اکابر محدثین اور جلیل القدر علمائے اسلام میں ہیں، اُن کی سُنن حدیث کی امہات کتب میں شامل ہے، اس لئے اُن کے حالات و سوانح اور اُن کی سُنن کا تعارف کرایا جاتا ہے،

نام و نسب ابو محمد کنیت، الحافظ لقب، اور عبد اللہ نام ہے، سلسلۂ نسب یہ ہے:- عبد اللہ بن عبد الرحمن بن فضل بن بہرام بن عبد الصمد[1]، علامہ خزرجی نے بہرام کے بجائے تہران لکھا ہے[2]،

نسبتیں وہ سمرقندی، تمیمی اور دارمی کی نسبتوں سے منسوب کئے جاتے ہیں، لیکن آخری نسبت سے جو دارم بن مالک کی جانب ہے[3] زیادہ مشہور ہوئے دارم کا قبیلۂ تمیم کی ایک شاخ دارم سے تعلق ہے،

ولادت وہ ۱۸۱ھ میں پیدا ہوئے، اسی سال عبد اللہ بن مبارک کا انتقال ہوا تھا[4]،

اساتذہ وہ قدمار میں ہیں، اس لئے اُن کو اجلہ علمار و مشائخ کا بابرکت زمانہ اور ان سے استفادہ

---

[1] تاریخ بغداد جلد ۱۰ ص ۲۹، تقریب التہذیب ص ۱۳۴، کتاب الانساب ورق ۲۱۸، تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱۵، تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۹۴، بستان المحدثین ص ۴۴، [2] خلاصہ تذہیب تہذیب الاکمال ص ۲۰۴، [3] تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۲۹، و کتاب الانساب ۲۱۸، [4] مقدمہ مسند دارمی ص

[5] تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۳۰، تذکرہ ج ۲ ص ۱۱۵، تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۹۶ و بستان ص ۴۵،

کا موقع میسر آیا، اُن کے مشہور اساتذہ اور شیوخ کے اسماء حسب ذیل ہیں،

احمد بن اسحاق حضرمی، اسود بن عامر شاذان، اشہل بن حاتم، ابوصالح کاتب لیث بن سعد، ابوبکر حنفی، ابوالمغیرہ حمصی، ابو عاصم، ابونعیم جعفر بن عون، حبان بن ہلال، ابوالیمان حکم بن نافع بہرانی، حیوۃ بن شریح، زکریا بن عدی، سعید بن عامر ضبعی، عبدالصمد بن عبدالوارث، عبداللہ بن موسیٰ، ابوعلی عبید اللہ بن عبدالمجید حنفی، عثمان بن عمر بن فارس، محمد بن مبارک صوری، محمد بن یوسف فریابی، مروان بن محمد، نضر بن شمیل، وہب بن جریر، ابوالنضر ہاشم بن قاسم، یحییٰ بن حسان تنیسی، یزید بن ہارون، یعلی بن عبید[1] وغیرہ،

تلامذہ اُن کی عظمت و اہمیت کی بنا پر اُن کی ذات طالبانِ حدیث کا مرکز بن گئی تھی، اور اساتذہ کی طرح اُن کے تلامذہ کا حلقہ بھی بڑا وسیع ہے جن میں سے اکثر ائمہ محدثین اور سرآمد روزگار فضلا میں شمار کیے جاتے ہیں، مثلاً ائمہ ستہ میں ابن ماجہ کے علاوہ سب کو اُن سے تلمذ کا فخر حاصل ہے، امام مسلم، ابوداؤد، اور ترمذی نے تو اپنی اپنی کتابوں میں بھی اُن سے روایتیں نقل کی ہیں، امام بخاری اور امام نسائی نے اگرچہ اپنی کتب میں اُن سے کسی روایت کی تخریج نہیں کی ہے تاہم یہ دونوں بزرگ بھی اُن کے شاگرد ہیں، دوسرے مشہور اور نامور علماء میں امام احمد کے فرزند عبداللہ، محمد بن یحییٰ ذہلی، ابوزرعہ اور ابوحاتم جیسے بلند پایہ محدثین کو اُن سے شرف تلمذ حاصل ہے بعض اور مشہور شاگردوں کے نام یہ ہیں:-

بقی بن مخلد، بندار بن بشار، جعفر بن محمد فریابی، حسن بن صباح بزاز، حفص بن احمد بن فارس، رجاء بن مرجاء، صالح بن محمد المعروف بجزرہ، عبداللہ بن واصل بخاری، عمر بن بجیر، عمر بن محمد بجیری، عیسیٰ بن عمر سمرقندی، محمد بن عبدوس بن کامل، سراج مطین وغیرہ،

[1] تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۲۹، کتاب الانساب ورق ۲۱۰، تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۹۴،

علم حدیث کے لئے جد و جہد اور سفر انھوں نے علم و فن کی تحصیل اور حدیث کی طلب و تکمیل کے لئے غیر معمولی جانفشانی سے کام لیا، اور متعدد مقامات، شام، بغداد، مصر، عراق، خراسان، اور مکہ و مدینہ وغیرہ کا سفر کیا، تاکہ وہاں کے ارباب کمال اور نامور مشائخ سے اکتساب فیض کریں، خطیب کا بیان ہے،

کان احد الرحالین فی الحدیث[1] — وہ ان لوگوں میں سے ایک تھے، جو حدیث کے لئے بہت زیادہ سفر کیا کرتے تھے،

دوسرے علمائے سیر نے لکھا ہے

رحل و طوف[2] — انھوں نے سفر کیا، اور ملکوں کی خاک چھانی،

شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:-

"صاحب رحلت و سفارست، اکثر بلاد اسلام را گشتہ و علم حدیث را از بلدان بعیدہ جمع کردہ[3]"

حافظہ حدیث کی طلب و تحصیل کے لئے جس محنت اور شوق کی ضرورت ہو، وہ ان میں موجود تھی، اس کے علاوہ حفظ و ضبط کا غیر معمولی ملکہ بھی اللہ تعالیٰ نے اُن کو عطا کیا تھا، اور تمام ائمہ فن کو اس کا اعتراف ہے، عبداللہ بن نمیر جیسے بلند پایہ محدث فرماتے ہیں کہ "دارمی حافظہ اور تقویٰ کے

[1] تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۲۹، و تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۹۶، و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱۶
[2] العبر ج ۲ ص ۸، و مرآۃ الجنان ج ۲ ص ۱۶۱، و شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۳۰،
[3] بستان المحدثین ص ۴۴،

اعتبار سے ہم پر فوقیت رکھتے ہیں[1]، "رجاء بن جابر مرجی کا بیان ہے کہ" میں نے ابن حنبل، اسحاق، ابن مدینی اور شاذکونی میں سے کسی کو عبد اللہ سے بڑا حافظ نہیں پایا[2]"، امام احمد سے اُن کے صاحبزادے عبد اللہ نے حفاظ حدیث کے متعلق دریافت کیا، تو انھوں نے چند نوجوانان خراسان کا ذکر کیا جن میں امام دارمی بھی شامل تھے[3]،

عبد اللہ کا بیان ہے کہ میں نے اپنے والد محترم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ حفظ چار آدمیوں پر ختم ہو گیا، جن میں سے ایک عبد اللہ بن عبد الرحمن دارمی بھی تھے[4]، عثمان بن ابی شیبہ ارشاد فرماتے ہیں کہ امام دارمی کے حفظ وضبط کے متعلق لوگوں نے جو کچھ بیان کیا ہے، وہ اس سے کہیں زیادہ فائق وبرتر تھے[5]،

ابن حبان کا بیان ہے کہ "وہ ان لوگوں میں تھے، جنھوں نے حدیثیں حفظ وجمع کیں[6]"، محمد بن ابراہیم شیرازی فرماتے ہیں کہ "ان کا حافظہ ضرب المثل ہے[7]"، ابو عبد اللہ حاکم کا بیان ہے کہ "وہ مشہور وبرگزیدہ حفاظ حدیث میں تھے[8]"، امام نووی لکھتے ہیں "ابو محمد دارمی اپنے زمانہ میں مسلمانوں کے حفاظ میں سے ایک تھے، اور بہت کم لوگ فضیلت وحافظہ میں ان کے مساوی اور ہمسر تھے[9]"، خطیب بغدادی فرماتے ہیں کہ وہ ان علماء اعلام اور حفاظ حدیث میں سے ایک ہیں جو احادیث کے حفظ وجمع کے لئے مشہور ہیں[10]،

---

[1] العبر ج ۲، ص ۸، وتہذیب ج ۵ ص ۲۹۵، وشذرات الذہب ج ۲، ص ۳۰، [2] تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۲۹ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱۶ وکتاب الانساب ورق ۲۱۹، [3] تدریب الراوی ص ۲۷۲، [4] ایضاً ص ۲۷۲، [5] تہذیب ج ۵ ص ۲۹۵، [6] ایضاً وخلاصۃ تذہیب ص ۲۰۴، [7] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۹۵ [8] تہذیب ج ۵ ص ۲۹۶ [9] مقدمہ مسند دارمی ص ۴، [10] تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۲۹،

بندار فرماتے ہیں کہ حفاظ دنیا چار ہیں، جن میں سمرقند کے عبد اللہ بن عبد الرحمن دارمی بھی ہیں[1]،

ثقاہت حافظہ کی طرح ان کی ثقاہت اور اتقان پر بھی علما و رجال، و ماہرین فن کا اتفاق ہے، ابو حاتم رازی فرماتے ہیں کہ وہ سب لوگوں میں زیادہ ثقہ وثابت تھے[2]" امام احمد کا بھی یہی خیال ہے، ایک مرتبہ انھوں نے فرمایا:- وکان ثقۃ وزیادۃ[3] یعنی وہ ماورائے ثقاہت ہیں، ابو حاتم اُن کو ثقہ وصدوق بتاتے ہیں[4]، ابن حبان نے ان کو حفاظ متقنین میں شمار کیا ہے[5]، خطیب نے بھی اُن کو صاحب صدق وثقاہت لکھا ہے[6]،

معرفت و درایت وہ احادیث کے معاملہ میں بڑی بصیرت اور اچھی پرکھ بھی رکھتے تھے، اور روایت کی طرح درایت کے لحاظ سے بھی ان کا مقام نہایت بلند تھا، بعض علماء فن کے اقوال ملاحظہ ہوں،

رجاء بن مرجی کا بیان ہے کہ "میں نے اُن سے بڑا کسی کو حدیث جاننے والا نہیں دیکھا[7]"، احمد بن سیار کہتے ہیں کہ حدیث کے معاملہ میں وہ بڑی گہری نظر اور غیر معمولی واقفیت رکھتے تھے، عثمان بن ابی شیبہ نے ان کے حافظہ کے ساتھ ان کی بصیرت وواقفیت کا بھی ذکر کیا ہے[9]، ابو منصور شیرانی فرماتے ہیں کہ اُن کی درایت ضرب المثل ہے[10]، علم حدیث میں اُن کی واقفیت اور تمیز پر لوگوں کو اس درجہ اعتماد تھا کہ اُن کے قول کے مقابلہ میں دوسرے لوگوں کے اقوال کو نظر انداز کر دیتے تھے، ایک شخص نے امام احمد کے سامنے ابن المنذر کی تعریف کی تو انھوں نے فرمایا کہ مجھ کو ان سے کوئی واقفیت نہیں، مگر کیا تم لوگوں کو عبد اللہ بن عبد الرحمن کا علم نہیں، اور پھر تین مرتبہ بتاکید کہا علیک بذلک السید[11]

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۹۶، [2] ایضاً، [3] ایضاً [4] ایضاً [5] ایضاً، [6] تاریخ بغداد جلد ۱۰ ص ۳۱ [7] ایضاً ص ۳۱، [8] تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۲۹۵

[9] ایضاً وتاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۳۲،

[10] ایضاً،

یعنی تم کو اس سردار کے دامن سے ضرور وابستہ رہنا چاہئے[1]، ایک اور شخص نے حمانی کے بارہ میں ان سے دریافت کیا، تو آپ نے فرمایا کہ عبداللہ بن عبدالرحمٰن کے قول کی وجہ سے ہم ان کو متروک سمجھتے ہیں[2]"
عبداللہ بن مبارک مخرمی فرماتے ہیں کہ اے اہل خراسان جب تک عبداللہ بن عبدالرحمٰن تمہارے درمیان موجود ہیں، تم کو کسی اور سے اشتغال رکھنے کی ضرورت نہیں[3]"

حدیث کی تائید و حمایت احادیث کی طلب و تکمیل اور خدمت و اشاعت کے علاوہ امام دارمی کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے حدیثوں کی مدافعت و حمایت کر کے مخالفین حدیث کا قلع قمع کر دیا، احادیث کے متعلق شکوک و اعتراضات کا جواب دیا، اور کذب و دروغ کی آمیزشوں سے ان کو پاک کیا، عوام و خواص سب کے دلوں میں حدیث کی اہمیت و عظمت اور سنت رسول کی محبت پیوست کر دی، اور اس کی جانب سے جو بے توجہی برتی جا رہی تھی، اس کو ختم کر کے علم حدیث و آثار کو فروغ بخشا، علماء رجال کا بیان ہے:۔

واظهر السنة فی بلده ودعا	اپنے وطن (سمرقند) میں حدیث و سنت
اليها وذب عن حريمها وقمع	کا بول بالا کر کے لوگوں کو اسکی جانب
مخالفيها،	مائل کر دیا، اور اس کی تائید و حمایت،
(خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال ص ۲۰۴)	کر کے مخالفین حدیث کا قلع قمع کر دیا

فضل و امامت وہ حدیث و آثار کی روایات و اشاعت اور اس کی تائید و حمایت کے نتیجہ میں اس فن کے مسلم امام قرار دئے گئے، معاصرین علماء نے ان کی اس حیثیت کو متفقہ طور پر قبول کیا ہے، امام احمد

۱؎ تاریخ بغداد ج ۱۰، ص ۳۲
۲؎ ایضاً ص ۳۱،
۳؎ ایضاً ص ۳۲،

بھی نے ان کو امام و سید کہا ہے[1]، ابو سعید اشج نے فرمایا کہ عبداللہ ہمارے امام ہیں[2]، ابو حاتم نے کہا کہ وہ اپنے زمانہ والوں کے امام تھے[3]، ابو حامد بن شرقی نے کہا کہ خراسان نے ۵ ائمہ حدیث پیدا کئے، ان میں سے ایک امام دارمی بھی ہیں[4]،

فقہ و تفسیر امام دارمی حدیث کے تو مسلم امام تھے ہی، لیکن دوسرے اسلامی علوم و فنون میں بھی ان کو پوری دستگاہ حاصل تھی، افسوس ہے کہ ان کے حالات بہت کم معلوم ہو سکے تاہم فقہ و تفسیر سے ان کی مناسبت اور تعلق کا اکثر ذکر کیا گیا ہے، ان فنون میں انھوں نے کتابیں بھی لکھی تھیں؛ علامہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ وہ ایک باکمال مفسر اور صاحب علم فقیہ تھے[5]، فقہ میں تو ان کو اجتہاد و تفقہ کا مقام حاصل تھا[6]، اور اس بنا پر خیال ہوتا ہے کہ وہ دوسرے ائمہ حدیث کی طرح کسی ایک امام کے مسلک سے وابستہ نہ رہے ہوں گے، بلکہ اپنے اجتہاد و تفقہ کے مطابق حدیث و سنت کی پیروی کرتے تھے،

پاکبازی اور تقویٰ امام دارمی علم کی طرح عمل کے اعتبار سے بھی ممتاز تھے، اور زہد و تقویٰ اور طہارت و پاکبازی کے لحاظ سے بھی ان کا مرتبہ نہایت بلند ہے، مگر افسوس ہے کہ ان کی سیرت کے اس پہلو کی کوئی تفصیل تاریخ و سیر کی کتابوں میں نہیں ملتی، تاہم تمام تذکرہ نگاروں نے ان کے زہد و اتقا کا ذکر کیا ہے، محمد بن عبداللہ بن نمیر فرماتے ہیں، کہ وہ ورع و تقویٰ کے اعتبار سے ہم سب پر فوقیت رکھتے تھے[7]، خطیب بغدادی کا بیان ہے کہ وہ زہد و ورع سے متصف تھے[8]، منصور شیرازی فرماتے ہیں کہ وہ اپنے زہد و اتقا، اور دیانت و عبادت کے لئے ضرب المثل تھے[9]، عبادت الٰہی میں

۱؎ خلاصہ تذہیب ص ۲۰۴، ۲؎ تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۳۱ ۳؎ ایضاً، ۴؎ ایضاً و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱۶ و تہذیب ج ۵ ص ۲۹۵، ۵؎ تہذیب ج ۵ ص ۲۹۵ ۶؎ ایضاً ۷؎ خلاصہ تذہیب ص ۲۰۴، ۸؎ العبر ج ۲ ص ۸ و شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۳۰ ۹؎ تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۳۲ ۱۰؎ تہذیب جلد ۵ ص ۲۹۵ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱۶،

انہماک و توغل کی بنا پر وہ قناعت پسند اور سادہ زندگی کے عادی ہو گئے تھے، اور دنیا کی لذت و آسائش سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے تھے، امام احمد کے سامنے ان کا تذکرہ کیا گیا، تو فرمایا کہ "مجھ پر کفر پیش کیا گیا، اور میں نے اس سے انکار کیا، لیکن ان کو دنیا پیش کی گئی، اور وہ اس کی جانب مائل اور متوجہ نہ ہوئے[1]، اُن کی زندگی عفت و پاکبازی کا نمونہ تھی، عثمان بن ابی شیبہ کا بیان ہے کہ لوگوں نے اُن کی عصمت اور پاکیزگیٔ نفس کے متعلق جتنا بیان کیا ہے وہ اس سے زیادہ عظیم اور برتر تھے"[2]

عقل و دانش ان کو اللہ نے حکمت و دانائی سے بھی خاص طور پر نوازا تھا، عام اہلِ سیر نے اُن کے بارے میں لکھا ہے کہ وکان عاقلاً فاضلاً[3] یعنی وہ عاقل و فاضل تھے، خطیب بغدادی کا بیان ہے کہ وکان علی غایۃ العقل و نہایۃ الفضل[4]، لوگوں کا بیان ہے کہ وہ اپنی متانت اور دانشمندی کے لئے مشہور تھے[5]،

عہدۂ قضا امام صاحب کے علمی تبحر، دینی عظمت اور عقل و فہم کی پختگی کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو سمرقند کا منصبِ قضا پیش کیا گیا، لیکن دنیوی جاہ و حشمت سے بے نیازی کی بنا پر انھوں نے اُس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا، مگر جب سلطان نے شدید اصرار کیا تو مجبوراً یہ عہدہ قبول کر لیا، لیکن صرف ایک بار فیصلہ کرنے کے بعد جب پھر انھوں نے مستعفی ہونے کی خواہش ظاہر کی، تو ان کا استعفا منظور کر لیا گیا[6]،

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۳۱ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱۶، [2] تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۹۵ [3] اعلام جلد ۲ ص ۵۶۳ [4] تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۲۹؛ [5] ایضاً و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱۶ و تہذیب ج ۵ ص ۲۹۵ [6] تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۲۹ و کتاب الانساب ورق ۲۱۰، و تذکرہ ج ۲ ص ۱۱۶ تہذیب ج ۵ ص ۲۹۶ و اعلام ج ۲ ص ۵۶۳،

وفات مشہور روایت کے مطابق امام دارمی نے تقریباً ۷۵ سال کی عمر میں اپنے وطن سمرقند میں بروز پنجشنبہ بعد نماز عصر تاریخ ۸ ذی الحجہ ۲۵۵ھ کو انتقال کیا، اور عرفہ کے دن جمعہ کو تجہیز و تکفین ہوئی، بعض مورخین نے لکھا ہے کہ انتقال عرفہ کے دن اور تجہیز و تکفین کی رسم نحر کے دن انجام پائی[1]،

احمد بن ابراہیم کرجی سمرقندی نے ۲۵۰ھ سنہ وفات بتایا ہے، مگر خطیب اور حافظ ابن حجر نے اس کو وہم قرار دیا ہے[2]،

امام بخاری کو جب ان کی وفات کی خبر معلوم ہوئی تو انھوں نے فرط غم سے سر جھکا کر اِنَّا لِلّٰہ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھا، اور اُن کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک کر چہرے پر آگئے، اور پھر بے ساختہ انھوں نے یہ شعر پڑھا،

ان تبق تفجع بالاحبۃ کلھم   وفناء نفسک لا ابالک افجع

اگر تو زندہ رہتا تو احباب کی مفارقت کے صدمے برداشت کرتا، حالانکہ تیرا صفحۂ ہستی سے معدوم ہونا سب سے زیادہ دردناک سانحہ ہے،

اسحاق بن احمد کہتے ہیں کہ ہم نے ان کو کبھی شعر پڑھتے ہوئے نہیں سنا بجز اس کے کہ کبھی روایتوں کے نقل و بیان کے سلسلہ میں شعر آجاتے، تو وہ اُن کو ضرورۃً روایت کر دیتے تھے[3]،

تصنیفات قدیم مصنفین کی طرح امام دارمی کی تصنیفات بھی زیادہ نہیں ہیں، اس لئے کہ اس زمانہ میں تصنیف و تالیف کا زیادہ رواج نہ تھا، نیز قدما کی اکثر تصنیفات معدوم

---

[1] بستان المحدثین ص ۴۵ [2] تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۳۲، و تہذیب ج ۵ ص ۲۹۶، [3] تہذیب جلد ۵ ص ۲۹۶ و بستان المحدثین ص ۴۵،

ہوگئیں، تاہم امام دارمی کی حسب ذیل تصنیفات کا ذکر ملتا ہے،

۱۔ کتاب التفسیر[۱]: یہ کتاب نایاب اور معدوم ہے، اس لئے اس کے متعلق کوئی معلومات فراہم نہیں ہوسکے،

۲۔ الجامع[۲]: صاحب اعلام نے اس کا نام الجامع الصحیح لکھا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے[۳] کہ یہ حدیث کی کتاب ہے، انھوں نے اس کو مطبوع بھی بتایا ہے[۴] اس سے خیال ہوتا ہے کہ سنن دارمی اور یہ دراصل ایک ہی کتاب ہو، مگر عام مصنفین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی مستقل تصنیف ہے، بعض اصحاب سیر نے اس کا نام کتاب الجامع[۵] لکھا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ فقہ و احکام کی کتاب ہے، تاہم یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا،

مولانا سید ابوالوزیر احمد حسن صاحب نے حاشیہ مشکوٰۃ میں امام دارمی کی ردجہمیت میں بھی بعض کتابیں بتائی ہیں[۶]، لیکن اُن کے نام نہیں تحریر فرمائے ہیں، اور نہ اس قول کا کوئی ماخذ تحریر کیا ہے،

۳۔ سنن دارمی: یہ امام دارمی کی سب سے مشہور اور اہم کتاب ہے، جو چوبیس فصول (کتب)، ایک ہزار چار سو آٹھ ابواب، اور تین ہزار پانچ سو پچپن (۳۵۵۵) صفحات پر مشتمل ہے، عام کتب حدیث کے برعکس اس کی ابتداء باب ما کان علیہ الناس قبل مبعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم من الجہل و الضلالۃ سے ہوتی ہے، اسی فصل میں مختلف ابواب کے اندر رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ان اوصاف و خصائص کا جو کتب قدیمہ میں مذکور ہیں، معجزات، محامد و فضائل، اتباع اہل سنت اور علم کی اہمیت

---

[۱] تاریخ بغداد جلد ۱۰ ص ۲۹، و ۳۲ – تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۱۱۶، خلاصۃ تذہیب تہذیب الکمال ص ۲۰۴
[۲] تاریخ بغداد جلد ۱۰ ص ۲۹، وکتاب الانساب ورق ۲۱۰، وخلاصۃ تذہیب تہذیب الکمال ص ۲۰۴،
[۳] اعلام ج ۲ ص ۵۶۳ [۴] ایضاً [۵] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱۶ [۶] تنقیح الرواۃ حاشیہ دیباچہ مشکوٰۃ ص ۶،
[۷] بستان المحدثین، ص ۴۴،

وغیرہ بیان کی گئی ہے، اس کے بعد عام کتب سنن کی طرح طہارت (وضو و غسل) اور نماز وغیرہ کے جملہ ابواب و فصول نقل کئے گئے ہیں، اور آخر میں وصایا اور فضائل قرآن کے ابواب ہیں،

سنن دارمی کا ایک قلمی نسخہ ۳۵۸ھ کا لکھا ہوا ۲۵۵، اوراق پر مشتمل کتب خانہ خدیویہ مصر میں موجود ہے[۱]، ۱۲۸۶ھ میں نواب صدیق حسن خاں صاحب حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے، اسی سال اُن کو مکہ معظمہ میں اس کا ایک نسخہ شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کے ذخیرۂ کتب میں ملا، اس کو مستعار لے کر انھوں نے مکہ ہی میں نقل کرنا شروع کیا، اور سمندر میں جہاز پر بھی اس کی نقل و تحریر کا کام جاری رکھا، اس کے علاوہ ان کو حرمین یا ہندوستان میں کوئی اور نسخہ دستیاب نہیں ہوسکا[۲]، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے پیش نظر بھی یہی نسخہ رہا ہوگا[۳]، ۱۲۹۳ھ میں مولانا عبدالرشید بن محمد شاہ کشمیری کی ترتیب و تحشیہ کے بعد مطبع نظامی کانپور سے شائع ہوا ہے، لائق مرتب کے پیش نظر دو اور نسخے بھی تھے، جن میں سے ایک کی تصحیح علامہ جزری صاحب حصن حصین نے کی تھی، اور یہ ۸۰۰ھ کا لکھا ہوا ہے، اس لئے انھوں نے حاشیہ میں دوسرے نسخوں سے اُس کے اختلاف کو بھی ظاہر کر دیا ہے، نیز مشکل الفاظ و لغات کی تشریح معنی و مفہوم کی مختصر وضاحت، اسماء رجال اور بلاد و اماکن اور اعراب وغیرہ کی تحقیق و تدقیق اور بعض دوسرے مسائل و مباحث سے بھی کہیں کہیں تعرض کیا گیا ہے، شروع میں مباحث کی مفصل فہرست اور آخر میں اغلاط نامہ بھی ہے، ابتدا میں ایک مقدمہ بھی ہے، جس میں سنت و حدیث کی اہمیت، محدثین کی عظمت، کتب حدیث کے اقسام کی تفصیل، امام دارمی کے حالات و سوانح اور سنن دارمی کے مقام و مرتبہ وغیرہ سے بحث کی گئی ہے،

---

[۱] فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج ۱، ص ۳۲۱، [۲] اتحاف النبلاء المتقین ص ۱۴۵ [۳] بستان المحدثین

(صفحہ ۴۴)

دارمی کی ثلاثیات کو الگ سے بھی مرتب کیا گیا ہے، حاجی خلیفہ کا بیان ہے:

ثلاثیات الدارمی ..... وھی خمسة عشر حدیثا وقعت فی مسندہ بسند عال[1]

کتاب ثلاثیات دارمی .... ان پندرہ حدیثوں پر مشتمل ہے، جن کو انھوں نے اپنی مسند میں بیان کیا ہے،

دارمی کی خصوصیات

۱- گو اس کتاب کو صحاح اور مسند احمد وغیرہ کی طرح شہرت ومقبولیت نہیں حاصل ہوسکی، تاہم اس کا شمار حدیث کی مشہور اور معتبر کتابوں میں ہوتا ہے، اور صحاح کے بعد کی اہم ترین کتابوں میں اس کو بھی سمجھا جاتا ہے، علمائے فن اور اساطین حدیث اس کی روایات و احادیث پر اعتبار کرتے ہیں، اور اس کو بطور ثبوت واستدلال پیش کرتے ہیں، مشکوٰۃ میں جو احادیث کا منتخب مجموعہ ہے، صحاح اور دوسری مشہور و معتبر کتابوں کی طرح اس کی احادیث بھی شامل ہیں، دوسرے مجموعۂ احادیث میں بھی اس کی روایات کو نقل کیا گیا ہے، امام صاحب کے تمام سوانح نگاروں نے ان کو صاحب المسند المشہور کے نام سے موسوم کیا ہے، شاہ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں، کہ کتاب او از احسن کتب حدیث است (اکمال شرح مشکوٰۃ ص ۱۲)

اس کتاب کی اہمیت واستناد اس سے بھی ظاہر ہے کہ بعض علماء کے نزدیک صحاح کی چھٹی کتاب یہی ہے، اس پر آگے بحث کی جائے گی، شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی نے کتب حدیث کے اقسام وطبقات بیان کرتے ہوئے اس کو تیسرے طبقہ میں محسوب کیا ہے[2]

۲- سنن دارمی کی ایک خصوصیت اس کی ثلاثی روایات بھی ہیں، اس میں ۱۵ ثلاثی حدیثیں ہیں، یہ تعداد بظاہر تو کم معلوم ہوتی ہے، لیکن سنن کی کمیت اور دوسری کتابوں کے مقابلہ میں کم

[1] کشف الظنون جلد ا ص ۳۵۵، [2] حجۃ اللہ البالغہ ج ا ص ۱۰۹،

نہیں ہے، علمائے فن کا بیان ہے:

وثلاثیاتہ اکثر من ثلاثیات البخاری[1] اس کی ثلاثیات بخاری کی ثلاثیات سے زیادہ ہیں،

اور رباعیات کا تو اس میں اچھا خاصہ حصہ موجود ہے[2]

۳- دارمی کی ایک خصوصیت علوئے اسناد بھی ہے، یعنی اس کی سندیں نہایت عالی اور بلند پایہ ہیں، علمائے حدیث کا بیان ہے کہ ولہ اسانید عالیۃ[3]

۴- محدثین کو اعتراف ہے، کہ دارمی کے اکثر رجال ثقہ وقوی اور بیشتر حدیثیں صحیح وثابت ہیں[4] اسی بنا پر علامہ ابن حجر نے اس کو سنن ابن ماجہ سے زیادہ اہم اور فائق قرار دیا ہے[5]

۵- امام دارمی نے صحابہ وتابعین کے اقوال وآثار بھی بکثرت نقل کئے ہیں بعض بعض ابواب میں تو صرف صحابہ وتابعین ہی کے آثار واقوال مذکور ہیں،

۶- جملہ محدثانہ خصوصیات اور فنی خوبیوں سے بھی یہ کتاب آراستہ ہے، متن روایات کے مفہوم ومنشار کی وضاحت، ابہام کی تشریح، دقیق الفاظ اور مشکل لغات کا حل، رواۃ کے اسمار کی مختلف حیثیتوں سے وضاحت، بلاد واماکن کی تحقیق، تعدد طرق، اختلاف اسناد اور متابعات کی تفصیل، صحت اسناد، رفعیت وعدم رفعیت کی توضیح، روایات اور ان کے الفاظ میں اختلاف و خطار اور شکوک واشتباہ کا ذکر، روایات اور رواۃ کے متعلق مختلف قسم کی وضاحتیں، اسانید کی وضاحت وتشریح، راویوں کے سماع، عدم سماع، لقار، اور عدم لقار کا ذکر، احادیث کی تصویب، ان کے درمیان ترجیح واسباب ترجیح، اور ان کے نسخ وعدم نسخ وغیرہ امور سے تعرض کیا گیا ہے،

۷- یہ اگرچہ حدیث کی کتاب ہے لیکن اس میں فقہی مباحث ومسائل کا بھی مختلف حیثیتوں سے

[1] الرسالۃ المستطرفہ ص ۲۹ [2] مقدمہ مشکوٰۃ ص ۱۵ [3] مقدمۂ دارمی ص ۳ الرسالۃ المستطرفہ ص ۲۹ [4] مقدمۂ دارمی ص ، [5] ایضاً،

ذکر کیا گیا ہے جس سے امام دارمی کے مرتبۂ اجتہاد اور فقہی بصیرت پر روشنی پڑتی ہے،

نظر و استدلال اور تفقہ و اجتہاد

اب ذیل میں ان کے نظر و استدلال، اور تفقہ و اجتہاد کی کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

باب "اذا قمتم الی الصلوٰۃ فاغسلوا وجوهکم" الخ میں اس مفہوم کی حدیثیں اور آثار نقل کئے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام ہر نماز کے لئے از سر نو وضو کرتے تھے، اس کے بعد وہ آنحضورؐ کے اس طرز عمل کا ذکر کرتے ہیں کہ فتح مکہ کے روز آپ نے کئی نمازیں ایک ہی وضو سے پڑھیں، اس سے وہ یہ استدلال کرتے ہیں کہ اللہ کے قول کا منشا یہ ہے کہ محدث اور غیر طاہر کو ہر نماز کے لئے وضو کرنا چاہئے، اسی لئے ایک اور روایت میں ہے لا وضوء الا من حدیث جو غیر محدث اور طاہر ہو، اس کے لئے ہر نماز کے لئے وضو کرنا ضروری نہیں ہے[1]

باب کراهية الجهر ببسم اللہ میں لکھتے ہیں:

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابو بکرؓ، عمرؓ، اور عثمانؓ، الحمد للہ رب العالمین سے قرأت شروع کرتے تھے، امام صاحب فرماتے ہیں کہ یہی ہمارا بھی مسلک ہے، اور ہم بسم اللہ الرحمن الرحیم کو زور سے کہنا پسند نہیں کرتے"[2]

باب الاستمتاع بجلود المیتة میں اس قسم کی روایت نقل کرنے کے بعد کہ سکھائے ہوئے چمڑے پاک ہوتے ہیں، تحریر فرماتے ہیں کہ میرا بھی یہی مسلک ہے، بشرطیکہ میتہ ان جانوروں میں سے ہو جن کا گوشت حلال ہے، اس کے ثبوت میں وہ یہ تحریر فرماتے ہیں، کہ رسول اللہؐ نے مردہ بکری کی جلد سے استمتاع کی اجازت دی، تو لوگوں نے عرض کی کہ وہ تو مردار ہے، رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اسی بنا پر تو اس کا گوشت حرام ہے، امام دارمی سے اس سلسلہ میں لومڑیوں کی کھالی ہوئی جلد کے بارہ میں پوچھا گیا تو انھوں نے کہا کہ میں اس کو مکروہ خیال کرتا ہوں[3]

۱؎ سنن دارمی ص ۹۰، ۲؎ ایضاً ص ۱۴۶، ۳؎ سنن جلد ص ۲۵۴

احادیث کی توجیہ و تاویل

امام دارمی ظواہر روایات ہی پر عمل نہیں کرتے، بلکہ ان کی مناسب تاویل و توجیہ اور حکمت و منشاء سے بھی بحث کرتے ہیں، مثلاً

رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ جب شدید گرمی پڑنے لگے تو ظہر کی نماز میں ابراد کرنا چاہئے، امام دارمی فرماتے ہیں کہ یہ حکم اس وقت کے لئے ہے جب گرمی کی شدت سے لوگوں کو اذیت محسوس ہونے لگے[1]

لہسن اور پیاز کے متعلق آپؐ نے فرمایا ہے کہ اس کو کھانے کے بعد کسی کو مسجد میں نہیں آنا چاہئے، دوسری روایتوں میں ہے کہ آپ کے پاس جب لوگ لہسن لائے، تو آپ نے ناپسندیدگی ظاہر کی، اور صحابہ سے فرمایا کہ تم لوگ کھالو میں کسی کو اذیت دینا پسند نہیں کرتا،

امام دارمی اس کی توجیہ اس طرح فرماتے ہیں کہ آنحضورؐ کی کراہت اس بنا پر تھی کہ اس کی بو سے لوگوں کو اذیت پہونچتی ہے، لیکن اگر دوسرے کو اذیت پہونچنے کا اندیشہ نہ ہو تو کھانے میں کوئی حرج نہیں،[2]

باب القنوت بعد الرکوع میں یہ روایت نقل کرنے کے بعد کہ رسول اللہؐ نے فجر کی نماز میں رکوع کے بعد دعائے قنوت پڑھی فرماتے ہیں کہ میں اس روایت کو تسلیم کرتا ہوں لیکن ایسے مواقع جنگ ہی کے لئے مخصوص سمجھتا ہوں،[3]

ایک حدیث میں ہے کہ جب کسی کو ولیمہ میں مدعو کیا جائے تو اسے دعوت قبول کرنی چاہئے، امام دارمی فرماتے ہیں کہ اس سے صرف دعوت قبول کرنا ثابت ہوتا ہے، دعوت کھانا کچھ ضروری نہیں ہے،

اس سلسلہ میں وہ حدیثوں کے مقصد و منشا اور غرض و غایت کی تعیین بھی کرتے ہیں، مثلاً:

۱؎ سنن ص ۱۴۲، ۲؎ ایضاً ص ۲۶۲، ۳؎ ایضاً ص ۱۹۸، ۴؎ ایضاً ص ۲۸۴

"باب فی الذہاب الی الحاجۃ" میں یہ روایت نقل کی ہے

کان لا یرفع ثوبہ حتی یدنو من الارض، قضائے حاجت کے لئے جب آپ بیٹھتے تو زمین سے بالکل قریب ہونے کے بعد کپڑا اٹھاتے تھے،

ایک اور روایت اس مفہوم کی بیان کی ہے کہ رسول اللہ رفع حاجت کے لئے آبادی سے بہت دور نکل جاتے تھے، امام دارمی فرماتے ہیں کہ یہ دونوں حدیثیں معنوی حیثیت سے ایک دوسرے کی حامل ہیں، اور اُن کا منشا یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ادب وشائستگی کا بڑا خیال کرتے تھے، اور آپ شرم وحیاء کا مجسمہ تھے[1]

مختار و مرجح مسلک کا ذکر

وہ اپنے مختار اور مرجح مسلک کا ذکر اور دو حدیثوں میں ایک کو ترجیح بھی دیتے ہیں، جیسے عام روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ فجر وعصر کی نمازوں کے بعد کوئی نماز نہیں پڑھی جا سکتی لیکن حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول کریمؐ ہمیشہ عصر کے بعد دو رکعتیں نماز پڑھتے تھے، امام دارمی فرماتے ہیں کہ اس سلسلہ میں میرا مسلک پہلی قسم کی روایتوں کی جانب ہے، جو حضرت عمرؓ سے مروی ہیں کہ فجر وعصر کے بعد طلوع وغروب سے پہلے کوئی نماز نہیں پڑھی جا سکتی ہے[2]

دو مختلف قسم کی روایتوں میں انھوں نے اصح واثبت کی نشاندہی کر کے اس کے مطابق اپنے عمل کا تذکرہ کیا ہے، لیکن عام طور سے وہ ان صورتوں میں ہر روایت کو بہتر خیال کرتے ہیں اور ان پر عمل کرتے ہیں لیکن کبھی کبھی روایتوں کے برعکس بھی وہ اپنے مسلک اور عمل کا ذکر کرتے ہیں، ان سب کی مثالیں موجب طوالت ہوں گی، اس لئے ان کو قلم انداز کیا جاتا ہے،

[1] سنن دارمی ص ۹۰ و ۹۱ [2] ایضاً ص ۱۶۵

جواز وعدم جواز اور وجوب وعدم وجوب وغیرہ کی بھی انھوں نے تصریح کی ہے، فقہا اور علماء کے مسالک اور اختلافات کا بھی انھوں نے تذکرہ کیا ہے، اور کبھی ان کے برخلاف اور کبھی ان کے اُن کے مطابق اپنی رائے قائم کی ہے، امام مالک کے مسلک ورائے کو خاص طور پر بیان کیا ہے،

فقہائے احناف کو محدثین سے عام طور پر یہ شکایت ہے جو ایک حد تک صحیح بھی ہے کہ انھوں نے احناف کے مسالک ومسائل نقل نہیں کئے ہیں، اور اگر کبھی نقل کیا ہے تو تحقیر وتردید کے انداز میں، مگر امام دارمی اہلِ عراق اور اہلِ کوفہ کے آراء ومسالک بھی بیان کرتے ہیں، اور کبھی ان کو مرجح اور کبھی مرجوح قرار دیتے ہیں، تشہد کے سلسلہ میں تو انھوں نے صرف حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہی کے مرویات نقل کئے ہیں جن پر احناف کے مسلک کا دار ومدار ہے،

اسی طرح نماز پڑھنے والا جب سجدہ کرے تو اس کے متعلق بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے پہلے گھٹنوں کو زمین پر رکھنا چاہئے، اور بعض سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے ہاتھ پھر گھٹنے رکھنے چاہئے، امام دارمی فرماتے ہیں کہ دونوں ہی حدیثیں ٹھیک ہیں لیکن اہل کوفہ پہلی قسم کی روایتوں کو ترجیح دیتے ہیں،

وسق کے متعلق فرماتے ہیں کہ ۶۰ صاع کا ہوتا ہے، اور ایک صاع اہلِ حجاز کے نزدیک ڈھائی من[1] کے اور اہلِ عراق کے نزدیک ۴ منوں کے بقدر ہوتا ہے،

بعض مواقع پر انھوں نے اہلِ حجاز کے مسلک کی تردید کی ہے،

مسند یا سنن دارمی امام دارمی کی اس کتاب کو مسند اور سنن دونوں کہا جاتا ہے، بعض لوگوں نے اس کو صحیح بھی کہا ہے[2]

[1] مَن ایک پیمانہ ہے، جو تقریباً ۱۰۰ مثقال کا ہوتا تھا، اس سے بہیر کا من مراد نہیں ہے،
[2] حواشی سندی ص ۱۱۵

مسند میں صحابہ کی ترتیب پر حدیثیں لکھی، اور مرتب کی جاتی ہیں، اور سنن کی ترتیب فقہی ابواب پر ہوتی ہے، اس میں احکام و مسائل سے متعلق روایات شامل ہوتی ہیں، اور ایمانیات و کتاب الطہارۃ سے لے کر وصایا تک کی حدیثیں ابواب کے ماتحت نقل کی جاتی ہیں، اس تعریف کے رو سے دارمی کا شمار مسانید کے بجائے سنن ہی میں ہونا چاہئے، حافظ ابن [illegible] کا بیان ہے :-

الکتاب السنن المسمّی بمسند الدارمی فانہ لیس دون السنن فی المرتبۃ [1]	کتاب السنن جو مسند دارمی کے نام سے موسوم ہے، مرتبہ میں عام سنن سے کمتر نہیں،

اور علامہ سیوطی فرماتے ہیں کہ

قیل و مسند الدارمی لیس بمسند بل ھو مرتب علی الابواب [2]،	کہا جاتا ہے کہ مسند دارمی مسند نہیں ہے، بلکہ اس کی ترتیب ابواب پر ہے،

نواب صدیق حسن خاں صاحب فرماتے ہیں :-

"و این کتاب برخلاف اصطلاح محدثین مشہور بمسند گشتہ حالانکہ مرتب بر ابواب ست نہ بر صحابہ پس باید کہ آنرا سنن دارمی گوید" [3]

صاحب شرح الفیہ فرماتے ہیں کہ :-

وقد عدہ ابن الصلاح فی المسانید ووھم فی ذالک	ابن صلاح نے اس کو مسانید میں محسوب کیا ہے، اور یہ ان کا وہم ہے

لے کشف الظنون ج ۲ ص ۳۳۴ ۲ے تدریب الراوی۔

۳ے اتحاف النبلاء المتقین ص ۱۲۵،

لانہ مرتب علی الابواب لا علی المسانید [1]،

کیونکہ اس کی ترتیب مسانید کے بجائے ابواب پر ہے،

لیکن اس کے باوجود ابن صلاح کے قول کو اس قدر شہرت ہوئی کہ اب وہ مسند دارمی ہی کے نام سے زیادہ موسوم و مشہور ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ برخلاف اصطلاح مشہور بمسند گشتہ [2]"

حقیقت یہ ہے کہ مسند کا اطلاق کبھی ان کتابوں پر بھی ہوتا ہے جو اگرچہ صحابہ کے ناموں پر مرتب نہیں ہوتیں، بلکہ فقہی ابواب پر مرتب ہوتی ہیں، لیکن ان کی احادیث کی سندیں حضور اکرمؐ تک منتہی و مذکور ہوتی ہیں، اسی لئے امام بخاریؒ نے اپنی کتاب کا نام الجامع المسند الصحیح المختصر من امور رسول اللہ وسننہ وایامہ رکھا ہے، امام مسلم نے بھی صحیح مسلم کو مسند کے نام سے تعبیر کیا ہے [3]، اس بنا پر سنن دارمی کو بھی مسند دارمی کہا جا سکتا ہے، مولانا عبدالحلیم چشتی لکھتے ہیں :-

"اسی طرح سنن دارمی کو مسند دارمی کے نام سے ذکر کرتے ہیں حالانکہ اس میں تمام حدیثیں مرفوع نہیں ہیں، مرسل، منقطع اور مفصل سب ہی کچھ ہیں، مگر مرفوعات کا ذخیرہ زیادہ ہے، اس لئے اس کو بھی مسند کہہ دیتے ہیں [4]"

عراقی کا بیان ہے کہ

اشتھر تسمیتہ بالمسند کما سمی البخاری کتابہ بالمسند لکون احادیث مسندۃ [5]	یہ مسند کے نام سے مشہور ہے جیسا کہ امام بخاری نے اپنی کتاب کا نام بھی مسند رکھا ہے کیونکہ اس کی احادیث کی سندیں ہیں

لے کشف الظنون ج ۲ ص ۲۳۴ ۲ے بستان المحدثین ص ۴۴ ۳ے فوائد جامعہ بر عجالہ نافعہ ص ۱۵۸،

۴ے فوائد جامعہ بر عجالہ نافعہ ص ۱۵۸، ۵ے کشف الظنون ج ۲ ص ۳۳۴ و اتحاف النبلاء ص ۲۵

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ دارمی کی تصنیف اپنی نوعیت و ترتیب کے لحاظ سے سنن میں شامل ہے، لیکن اس کو مسند بھی کہا جا سکتا ہے،

کیا مسند دارمی صحاح ستہ میں ہے؟ جمہور علماء کے نزدیک صحاح کی چھٹی کتاب سنن ابن ماجہ ہے، لیکن بعض لوگوں نے موطا امام مالک کو اور بعض نے دارمی کو بھی صحاح کی چھٹی کتاب قرار دیا ہے، مغلطائی کی یہی رائے ہے، اور حافظ ابن حجرؒ کا رجحان بھی اسی جانب ہے،

جن علماء نے ابن ماجہ کے بجائے دارمی کو صحاح میں شامل کر لیا ہے اُن کے دلائل یہ ہیں کہ دارمی ابن ماجہ کے مقابلہ میں صحت کے لحاظ سے فوقیت رکھتی ہے، اور اس کی سندیں عالی، رجال زیادہ تر صحیح و ثابت اور رباعیات بکثرت اور منکر و شاذ روایات بہت کم ہیں، علاوہ ازیں امام ابن ماجہ کے مقابلہ میں امام دارمی کا زمانہ بھی قدیم ہے، اور فضل و کمال کے لحاظ سے بھی ان کا مرتبہ زیادہ ہے،

مگر ہماری ناقص رائے میں جمہور ہی کی رائے درست معلوم ہوتی ہے، اس کے بعض وجوہ ہم اپنے مضمون ابن ماجہ اور اُن کی سنن میں لکھ چکے ہیں[1]،

ایک شبہہ کا ازالہ مسند دارمی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ مرسل، موقوف، منقطع اور معضل روایات پر مشتمل ہے، اس لئے اس کا بھی جائزہ لینا مناسب ہو گا امام دارمی کی مسند کے بارہ میں اس قسم کی بات بخاری کے مقابلہ میں کہی گئی ہے، عراقی کا پورا بیان حسب ذیل ہے:

واشتهر تسميته بالمسند كما	یہ مسند کے نام سے مشہور ہے جس طرح
يسمى البخاري كتاب المسند	کہ امام بخاری نے اپنی کتاب کا نام
الجامع الا ان مسند الدارمي	المسند الجامع رکھا ہے، (لیکن بخاری
كثير الاحاديث المرسلة والمنقطعة	کے مقابلہ میں) دارمی میں مرسل، منقطع

---

[1] معارف جون ۶۰ء،

والمفصلة والمقطوعة[1]	معضل اور مقطوع روایتیں زیادہ ہیں

اور یہ صحیح ہے کہ اسناد کے رفع و اتصال کے لحاظ سے دارمی کو بخاری کے مقابلہ میں لانا درست نہیں ہے،

دوسرے جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ علمائے فن کے نزدیک دارمی کے بہت کم رجال و رواۃ ضعیف ہیں، اور اس کی اسناد عالی ہیں، اور اس میں منکر و شاذ روایات بہت کم ہیں، ایسی صورت میں روایات کا ارسال و انقطاع اور وقف کوئی قابل اعتراض چیز اور عیب نہیں ہے، بلکہ اس سے دارمی کا غیر معمولی حزم و احتیاط ظاہر ہوتا ہے، احادیث کی صحت، وثوق اور شہرت میں اس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا، موطا امام مالک کا بھی یہی حال ہے، کہ اس میں مرسل، موقوف اور منقطع روایتوں کی زیادتی ہے، لیکن اس کے باوجود بعض علماء اس کی صحت و شہرت کی بنا پر اس کو صحاح ستہ میں شامل کرتے ہیں، شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے تو اس کو طبقۂ اولی اور صحیحین کے ہم پایہ قرار دیا ہے بلکہ بعض علماء کے نزدیک وہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے[2]،

---

[1] کشف الظنون ج ۲ ص ۴۳۳ [2] اس کی تفصیل کے لئے حیات مالک از علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم ملاحظہ ہو،

عوارفُ المعارف

کا

ایک قدیم نسخہ

از حکیم محمد عمران خاں صاحب، بسیۃ ڈسٹرکٹ لائبریری ٹونک

عوارف المعارف، شیخ شہاب الدین سہروردی (۵۳۹ھ - ۶۳۲ھ) کی مشہور معرکۃ الآرا تصنیف ہے، اس کتاب کے بیشمار قلمی نسخے اطراف و اکناف عالم میں پھیلے ہوئے ہیں، ہر اچھے کتبخانہ میں اس کا اچھا نسخہ مل جاتا ہے، اس وقت اس کا ایک قدیم نسخہ پیش نظر ہے، چونکہ اس کا ذکر اہل علم حضرات کی دلچسپی سے خالی نہیں، اس لیے اس نادر نسخہ کے سلسلہ میں ضروری معلومات پیش کیجا رہی ہیں، یہ نسخہ حضرت والد مرحوم مولوی حکیم قاضی محمد عرفان خاں صاحب، مرحوم ناظم عدالت شریعت ٹونک کے کتب خانہ کی ملکیت ہے، اس کا کاغذ حنائی آبدار ہے، قدرے کرم خوردہ ہے، خط نسخ پختہ قدیم، جلی و واضح ہے، تقطیع متوسط ہے، تقریباً ۲۵ اجزا پر مشتمل ہے، ابتدائی نصف حصہ محشی بھی ہے، صحاح، کشاف، معالم التنزیل، تہذیب و نووی شرح صحیح مسلم وغیرہ سے یہ حواشی لکھے گئے ہیں، ۱۸ صفر ۷۳۲ھ کو یہ نسخہ ایران میں لکھا گیا، گویا وفات مصنف سے ایک سو سال بعد، ابراہیم بن محمد بن ابراہیم بن نصر بن الدیوانی اس کے کاتب ہیں، جو ابو سعید محمد بن ضیاء الدین مسعود بن محمد بن مسعود بن محمد بن علی بن احمد بن ابی علی دقاق کے شاگرد ہیں، عوارف المعارف کی اجازت بھی کاتب کو انہی شیخ سے ملی ہے جو ۱۲ صفر ۷۳۲ھ کو حاصل ہوئی، موصوف کی مسند درس فارس میں بچھی ہوئی تھی، وہیں یہ اجازت حاصل ہوئی، کاتب نے

ابتدائے کتاب میں حسب دستور علمائے متقدمین اپنی سند بھی نقل کی ہے جو اس طرح ہے:-

"اما بعد فقد اخبرنا الشیخ الامام الاعلم الافضل الاکمل قدوۃ العلماء والفضلاء مقتدی السالکین والاتقیاء ناقل احادیث النبویۃ شارح سنن المصطفویۃ مسند الفارس سعید الملۃ والحق والدین ابو سعید محمد بن شیخ الشیوخ ضیاء الدین مسعود بن محمد بن مسعود بن محمد بن علی بن احمد بن شیخ شیوخ الآفاق ابی علی الدقاق مد اللہ ظلالہ لاستفادۃ کافۃ المسلمین عن الانبیاء والمرسلین قراءۃ علیہ وانا اسمع فی وقت العصر من یوم الاحد فی احدی وعشرین من شہر المبارک الصفر سنۃ اثنتین وثلثین وسبعمائۃ عند التربۃ المرشدیۃ حفہا اللہ بالانوار القدسیۃ قال اخبرنا ظہیر الدین اسمٰعیل بن المظفر بن محمد الشیرازی رحمہ اللہ قال اخبرنا عم والدی شمس الدین ابو المفاخر عمر بن المظفر قال انا الشیخ الصالح نجیب الدین ابوبکر عبد اللہ بن محمد بن ثابت القلانسی قال انا الشیخ المقتدی ابو المبارک عبد اللہ بن محمد بن منصور الادمی الشیرازی قال انا الخطیب ابو محمد عبد السلام بن عبد الکریم بن علی بن سعد قال انا الشیخ المحقق المدقق قبلۃ السالکین وکعبۃ الواصلین مبین احکام الشریعۃ کاشف مشکلات الطریقۃ موضح غامضات الحقیقۃ مقبول الخالق والخلائق ابو اسحٰق ابراہیم بن شہریار الگازرونی قدس اللہ سرہ"

"عوارف المعارف" ۶۳ بابوں پر مشتمل ہے، پیش نظر نسخہ مکمل ہے، کاتب نے جن الفاظ میں کتاب ختم کی ہے وہ اس طرح ہے:-

"تم کتاب عوارف المعارف بحمد اللہ وحسن توفیقہ وصلی اللہ علی محمد وآلہ اجمعین

وکتب العبد الضعیف المحتاج الی رحمۃ اللہ تعالیٰ ابراهیم بن محمد بن ابراهیم بن نصرویۃ الدیرانی فی وقت العصر من یوم الثلثاء فی ثمان عشر من شهر المبارک الصفر سنة اثنین وثلثین وسبعمائة حامداً ومصلیاً لله ورسوله"

مذکورہ خصوصیات کے علاوہ یہ نسخہ مختلف ادوار میں مختلف علما کے زیر مطالعہ بھی رہا ہے، جیسا کہ کتاب کے حواشی سے پتہ چلتا ہے، مختلف خطوط میں اسکی تحشی کی گئی ہے، مرور ایام سے کتاب کے گوشے بوسیدہ ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے حواشی کہیں کہیں سے مقطوع و ناقص ہیں، لیکن اصل کتاب مکمل ہے، کتاب کی حالت سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب کافی استعمال میں آئی ہے اور اکثر حضرات کے مطالعہ میں رہی ہے۔

کاتب کا سلسلۂ تلمذ چونکہ ابو اسحٰق ابراہیم بن شہریار گازرونی سے ملتا ہے، اس لیے عوارف المعارف کے اس نسخہ کے ساتھ موصوف کا ایک رسالہ وصیت بھی شامل ہے، جو ایک جزو پر مشتمل ہے، یہ وصیت ابو اسحٰق ابراہیم بن شہریار گازرونی نے ابو الفتح عبد السلام بن احمد بن محمد بن سالبہ کو کی تھی، یہ رسالہ بھی کاتب موصوف کا لکھا ہوا ہے، تاریخ کتابت اگرچہ درج نہیں ہے لیکن رسالہ کی ابتدا میں اپنی سند و اجازت نقل کی ہے، جمادی الآخر ۷۳۱ھ میں موصوف سے یہ اجازت حاصل کی، سند وہی ہے جو عوارف میں نقل کی گئی ہے، البتہ اس رسالہ میں کاتب نے اپنے شیخ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"امابعد فقد اخبرنا سیدنا ومولانا ومقتدانا الشیخ الفاضل الکامل سید العلماء الراسخین مقتدی الافاضل المتقین قدوة السالکین المجتهدین فرید دهره ووحید عصره...... ادام الله ظلال جلاله ومتع المسلمین بدوام انفاسه العلویة ودرر طاعاته الشریفة...... قراءة علیه وانا اسمع فی جمادی الاخری سنة احدی وثلثین وسبعمائة عند راس التربة المرشدیة ...... الخ"

اس کے بعد اصل رسالہ شروع ہوتا ہے، ابتدائی حصہ کا قدرے اقتباس درج ذیل ہے،

"سلامہ اللہ تعالیٰ علیک یا ولدی وعدتی ..... وانی قد کتبت بالوصیة التی کنت

شافهتک بها وهی تحتوی علی فصول تتضمن کل فصل منها آیات...... اول ما اوصیک التوقر علی العلوم الشرعیة الخ"۔

ابو اسحٰق ابراہیم بن شہریار گازرونی فارس کے مشہور بزرگ گذرے ہیں، مولانا جامی نفحات الانس میں لکھتے ہیں:۔

"فارسی الاصل است و مولد و منشا اش نورو ناحیه گازرون بوده و شهریار پدر شیخ مسلمان شد وولادت شیخ وسال ولادتش در زمان اسلام بوده و انتساب شیخ در تصوف به شیخ ابو علی حسین بن محمد الفیروزآبادی الاکار بوده و بصحبت بسیاری از اصحاب حدیث رسیده بود در گازرون و شیراز و بصره و مکه و مدینه و از همه روایات حدیث بر آمده داشت در مکه شیخ ابو الحسن علی بن عبد الله بن جهضم همدانی را دیده بود...... توفی رضی الله عنه فی شهر ذی القعده سنه ست وعشرین واربعمایة"۔

کاتب موصوف نے اس "کتاب الوصیۃ" کو ان الفاظ میں ختم کیا ہے:۔

"تمت ورواه العبد الاحوج الی رحمة الباری ابراهیم بن محمد بن ابراهیم بن نصرویه نفعه الله کتابته وروایته بحق النبی الامی وأسرته والحمد لله حق حمده والله اعلم تم کتاب الوصیة من مصنفات الشیخ الواصل مقتدی الاولیاء والمحققین قدوة النبلاء المتقین اکمل العلماء والواصلین ابی اسحٰق ابراهیم بن شهریار الکازرونی قدس سره علی الامام الهمام مفخر الانام سند الفارس افضل العلماء الراسخین ...... الخ"

نسخہ نہایت صحیح اور نادر الوجود ہے، ایک عالم کے قلم کا لکھا ہوا ہے، اور اہل علم حضرات کے زیر مطالعہ رہنے کی وجہ سے کتاب کی ندرت میں کہیں اضافہ ہو گیا ہے،

"عوارف المعارف" کے پیش نظر نسخہ کی مزید خصوصیت یہ ہے کہ اس کے آخر میں "عوارف" کے کسی دوسرے نادر اور تاریخی نسخہ کا ایک آخری ورق شامل ہے، جو کبھی کسی طرح اپنے اصلی نسخہ سے علٰحدہ ہو گیا اور نادر ہونے کی وجہ سے برائے حفاظت اس نسخہ میں شامل کر دیا گیا، یہاں اس ورق کا ذکر اس غرض سے کیا جا رہا ہے کہ اگر کسی صاحب کے علم میں عوارف کا کوئی نادر نسخہ ہو اور اس کا ورق آخر ناقص یا غیر خط کا ہو تو مطلع فرمائیں، ممکن ہے کہ اس طرح اس نسخہ کی تکمیل ہو جائے،

یہ حصہ "عوارف المعارف" کا صرف ورق آخر ہے جو اسی صدی کا لکھا ہے جس میں مصنف کی وفات ہوئی ہے، یہ ورق "عوارف" کی اس عبارت سے شروع ہوتا ہے،

(قال بعضهم اعرف الخلق بالله اشدهم تحیراً) "فیه یجوز ان یکون معنی ذٰلک ما ذکرناه انه" الخ

محمد بن علی بن محمد الحافظ اس کے کاتب ہیں، ۱۳ جمادی الاولیٰ ۶۷۸ھ اس کی تاریخ کتابت ہے، کاتب نے ان الفاظ میں کتاب کو ختم کیا ہے:-

بید اضعف خلق الله تعالیٰ واحوجهم الی رحمته محمد بن علی بن محمد الحافظ فی یوم الجمعة الثالث عشر جمادی الاولیٰ سنة ثمان وسبعین وستمائة حامد الله تعالیٰ ومصلیا علی رسوله محمد وآله...... راجیا من الله الکریم انکشاف حقائق معانیه واطلاع دقائق مبانیه.... خلقه محمد وآله وصحبه اجمعین"

یہ نسخہ جس کا یہ ورق ہے ۷۳۲ھ میں کسی صاحب کی ملک میں رہا ہے، جیسا کہ اس ورق کے صفحہ ثانی کے بالائی حصہ کی محررہ عبارت سے پتہ چلتا ہے، یہ حصہ کچھ کرم خوردہ ہے جس کی وجہ سے عبارت پوری طرح سمجھ میں نہیں آتی، جو حصہ پڑھا جا سکتا ہے وہ یہ ہے،

کتاب عوارف المعارف للشیخ...... بن عبد الله بن سعد بن الحسین بن القاسم بن النضر

بن عبد الله بن عبد الرحمٰن...... بن ابی بکر الصدیق رضی الله عنه......

فی رجب...... سنة اثنی اثنین ستمائة والحمد لله رب العلمین... علی من لا نبی بعده"

یہ نسخہ شاہان مغلیہ کے کتب خانوں کی زینت بھی بنا رہا ہے، آخر میں اس ورق پر چار مہریں ثبت ہیں، اول مہر خرد و بیضوی "عنایت خاں[1]" کی ثبت ہے، اس کے ساتھ یہ عبارت درج ہے: "شانزدہم محرم عرض دیدہ شد" اس کے بعد دوسرے خط سے درج ہے: "دوازدہم رجب المرجب ۱۰۷۱ھ عرض دیدہ شد"

اس عبارت کے ساتھ کوئی مہر نہیں ہے، دوسری مہر بھی بیضوی ہے، مگر سابق سے قدرے بڑی، اس مہر کی پوری عبارت سمجھ میں نہیں آتی، البتہ مہر کے بالائی حصے میں "محی الدین" ضرور پڑھا جاتا ہے، اس مہر کے ساتھ "دوازدہم رجب المرجب ۱۰۷۵ھ عرض دیدہ شد" تحریر ہے، دو مہریں مزید ثبت ہیں لیکن کسی طرح نہیں پڑھی جاتیں، حاشیہ پر کچھ عبارت بھی لکھی ہوئی ہے، لیکن امتداد زمانہ کی وجہ سے حروف کاغذ پر سے اڑ گئے ہیں،

یہ ورق کس دور میں اپنے اصلی نسخہ سے علٰحدہ ہوا کچھ نہیں کہا جا سکتا، عوارف کا پیش نظر نسخہ اور اس آخری ورق کی محررہ تاریخ ایک ہے، ہو سکتا ہے کہ یہ قدیم نسخہ بھی فارس کے علاقہ میں رہا ہو اور پھر ہندوستان آکر شاہان مغلیہ کے کتب خانوں کی زینت بنا ہو، اور یہ بھی امکان ہے کہ اسی وقت سے یہ ورق اصل نسخہ سے علٰحدہ ہو کر اس نسخہ میں شامل کر دیا گیا ہو، اور اسی طرح یہ پیش نظر نسخہ بھی شاہان مغلیہ تک پہنچا ہو، واللہ اعلم

بہر حال اہل علم حضرات اس سلسلہ میں اپنی معلومات سے مزید مستفیض فرمائیں، خدا کرے اس ورق کا اصل نسخہ بھی کسی کتب خانہ میں محفوظ ہو،

---

[1] شاہجہاں کے کتب خانہ کا داروغہ تھا، نام مرزا محمد طاہر آشنا پسر ظفر خاں احسن، اسی نے شاہجہاں کے عہد کی بعض تاریخوں کا خلاصہ ترتیب دیا جو "ملخص" کے نام سے مشہور ہے،

تلخیص و تبصرہ

قاضی جرجانی کے تنقیدی افکار

از

جناب سید احتشام احمد ندوی ایم اے۔ بی ٹی ایچ ڈی (علیگ) لکچرر شعبہ عربی ونکٹیشور یونیورسٹی آندھرا پردیش

قاضی جرجانی اس لحاظ سے عرب ناقدوں میں ممتاز ہیں کہ انھوں نے آمدی کے بعد عملی تنقید کی رسم کو زندہ رکھا اور متنبی پر ایک ایسی کتاب لکھ کر دی جس میں اس کی شاعرانہ خوبیوں کے علاوہ عام عربی شاعری کے بہت سے مسائل پر بھی مباحث ہیں،

قاضی جرجانی کا طرز استدلال یہ ہے کہ اگر متنبی کے معترضین کوئی اعتراض کرتے ہیں، تو وہ اس کیلئے تمام عربی شاعری کو چھان کر مثالیں تلاش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر متنبی نے ایسا کیا ہے تو فلاں فلاں شاعروں نے بھی ایسی ہی غلطیوں کا ارتکاب کیا تھا۔

قاضی جرجانی نے لکھا ہے کہ جس قوت سے میں متنبی کی حمایت کر رہا ہوں، اس سے یہ شبہہ نہ ہونے پائے کہ میں ایک فریق بن کر سامنے آیا ہوں اور ایک حاکم وقت کی طرح اپنی بات منوانا چاہتا ہوں، اگر کسی کے دل میں میری جانب سے یہ شبہہ گذرے تو میں اس کو اپنی سچائی و دیانت داری کا یقین دلاتا ہوں اور میں ایک صحیح بات لوگوں تک پہنچا دینا چاہتا ہوں اور جو کچھ مجھے معلوم ہے نقد شعر کے بارے میں وہ میں دوسروں تک منتقل کر دوں گا، اگر کوئی کسی موقع پر مجھے جادۂ صواب سے ہٹا ہوا دیکھے تو مجھے میری غلطی پر متنبہ کر دے[1]

[1] الوساطۃ بین المتنبی وخصومہ مؤلفہ قاضی ابو الحسن الجرجانی مطبوعہ تبریز ص ۱۳۷ - ۱۴۱

نظائر تلاش کر کے اس پر فیصلہ کرنا جرجانی کا خاص طرز تنقید ہے، وہ لکھتے ہیں کہ شعرائے جاہلیت اور اسلام کے دواوین موجود ہیں، ان میں کیا کوئی قصیدہ بھی ایسا مل سکتا ہے جس میں ایک یا اس سے زیادہ اشعار ایسے ہوں گے جو کسی نہ کسی عیب کے حامل ہوں گے، کہیں الفاظ خراب ملیں گے، کہیں معنی، کہیں نظم و ترتیب کی خامی ہوگی اور کہیں اعراب کا نقص، اگر اہل جاہلیت کے بارے میں لوگوں میں حسن اعتقاد نہ پیدا ہو گیا ہوتا اور تقدم کا شرف ان کو حاصل نہ ہوتا تو ان کے بے شمار اشعار معیار سے گرے ہوئے نظر آتے، لیکن حسن ظن و حسن اعتقاد کے پردے ان کے عیوب کو ڈھانکے ہوئے ہیں،[1]

متنبی کی خوبیوں کی مدافعت کرتے ہوئے جرجانی رقمطراز ہیں کہ شاعری علوم عرب میں ایک ایسا علم ہے جس میں انسانی فطرت، روایت اور ذہانت کو یکساں حیثیت حاصل ہے، مشق و ممارست اس کا ایک خاص عنصر و مادہ ہے، جس سے قوت پیدا ہوتی ہے، جس شاعر میں مذکورۂ بالا صفات موجود ہوں وہ یقیناً ایک عظیم اور ممتاز شاعر ہوتا ہے، ان ہی صفات کے لحاظ سے شاعر کی عظمت کا تعین بھی ہوتا ہے، میں جاہلی و مخضرمی، جدید و قدیم، اعرابی اور مولد کے مسائل سے قطع نظر کر کے کہتا ہوں کہ محدث کو روایت کی ضرورت نسبتہً زیادہ شدید ہے اسی طرح اس کو حفظ کرنے کی بھی زیادہ احتیاج ہے، جب اس معاملہ میں ہم تحقیق کریں گے تو معلوم ہوگا کہ فطری اور ذہین شاعر کے لیے بھی یہ ممکن نہیں کہ وہ بغیر روایت کے عربوں کے الفاظ پر قادر ہو سکے، عرب زمانۂ قدیم سے روایت اور حفظ کے قائل رہے ہیں، اور ایک شاعر دوسرے کا راوی ہوتا آیا ہے، عربوں کی زبان تو مشترک تھی، مگر قبائل میں فصاحت کی بڑی اہمیت تھی، عرب میں ایک شاعر کو دوسرے شاعر پر اور ایک خطیب کو دوسرے خطیب پر فصاحت کی وجہ سے فضیلت دی جاتی تھی،[2]

[1] الوساطۃ ص ۱۴ - ۱۵ [2] ایضاً ص ۲۱

زبان اور شاعرانہ ذوق کی تبدیلی پر جرجانی بڑی گہرائی سے بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عرب زمانۂ قدیم سے الفاظ کی شوکت کے قائل تھے، اور حسن کلام کے ایسے شائق تھے کہ دوسروں کے یہاں شاید اس کی مثال نہ مل سکے، وہ اپنے اشعار پر خاص توجہ دیتے اور اس کی پوری کوشش کرتے کہ زبان میں حسن پیدا ہو، یہاں تک کہ چست ترکیبیں اور پر شکوہ الفاظ ان کی زبان کے خاص امتیازات ہو گئے، فطری رجحان اور شعوری کوشش نے زبان کے مسئلہ میں ان کو دوسروں پر برتری عطا کی۔ "بدویت" کی وجہ سے مشکل الفاظ و تراکیب ظہور پذیر ہوئیں، جن کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے بدویت کا اظہار کیا اس نے زیادتی کی، عدی کے اشعار جو جاہلی تھا فرزدق سے زیادہ سلیس ہیں، رقت ہمیشہ ایسے شعراء کے اشعار میں پائی جاتی ہے جو عاشق اور صاحب دل ہوئے یا ان کی طبیعت میں شاعرانہ جذبہ بھرپور ہو تو رقت اور کشش غیر شعوری طور پر پیدا ہو جاتی ہے،

جب اسلام کا ظہور ہوا اور دیہاتوں کے لوگ شہروں کی جانب آنے لگے تو لوگوں نے عام اور آسان زبان کو زیادہ پسند کیا، جن اشیا کے بہت سے اسماء تھے ان میں آسان اور خوبصورت ناموں کو چن لیا، مثلاً "طویل" ایک لفظ ہے، اس کے لیے ۶۰ الفاظ اور بھی عربوں کی زبان میں تھے، مگر انھوں نے اس لفظ کے اچھے ہونے کی وجہ سے باقی الفاظ کو متروک قرار دیا، اور ایسے معانی و الفاظ اختیار کیے جو حسین اور آسان ہوں، جن شعراء نے بعد میں قدماء کے مشکل اسالیب و الفاظ کی پیروی کرنی چاہی، وہ بہت جگہ پھسل گئے اور جادۂ صواب سے ہٹ گئے، جیسے کہ ابو تمام[1]

یہ تجزیہ جرجانی نے اچھا کیا ہے، ابو تمام کے بعض عیوب کا ذکر بھی انھوں نے اس انداز سے کیا ہے کہ ابو تمام نے بھی غلطیاں کی تھیں اور متنبی نے بھی ان کا ارتکاب کیا، اس لیے متنبی ہی پر کیوں

---

۱ الوساطۃ ص ۲۳

الزام رکھا جائے۔

قاضی جرجانی کہتے ہیں کہ اگر تم کو لفظ کا صحیح استعمال معلوم کرنا ہو اور عمدہ شاعری کا نمونہ دیکھنا ہو تو قدماء میں جریر اور ذوالرمہ کا کلام دیکھو، اور متاخرین میں بحتری کا، تغزل میں اہل حجاز کا کلام قابل مطالعہ ہے، مثلاً کثیر، جمیل بثینہ اور نصیب کا، فیصلہ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ شعر بہتر ہے جس میں فطری شاعرانہ کیفیت نمایاں ہو اور تکلف و سختی کا نام بھی نہ ہو، انھوں نے بتایا کہ الفاظ کا حسن پہلے متاثر کرتا ہے، اور معانی بعد میں، فطری شاعری کی زیادہ مثالیں ہم کو بحتری کے یہاں ملتی ہیں،[2]

عربوں کے نزدیک شعراء میں حفاظت کے اصول مجملاً یہ تھے کہ معانی عمدہ اور پرکشش ہوں اور صحت پر دلالت کریں، اسی طرح الفاظ اچھے ہوں، صحیح ہوں، وصف عمدہ اور مؤثر ہو، تشبیہ معنی کو واضح کرتی ہو، جس کو شاعرانہ مقبولیت عطا ہوئی اور جس کے اشعار کثرت سے ضرب الامثال بن گئے، وہ مطابقت، تجنیس، استعارہ اور بدیع کے چکر میں نہیں پڑا، محدثین نے دیکھا کہ تشبیہ، استعارہ اور مطابقت وغیرہ سے حسن پیدا ہوتا ہے تو انھوں نے تکلف سے شعوری طور پر اشعار میں ان اشیاء کو بھرنا شروع کر دیا، اس صفت کا نام "البدیع" رکھا، بعض تو واقعی اس کوشش میں کامیاب ہوئے اور بعض بالکل ناکام رہے، یا ایک ہی شاعر کہیں کامیاب اور کہیں ناکام رہا،[3]

ابو تمام کی طرح متنبی پر بے دینی کا الزام تھا، جرجانی کہتے ہیں کہ دین الگ ہے، اور شاعری الگ، دونوں میں کوئی تعلق نہیں، اور نہ کوئی تضاد ہے، حضورؐ نے خود بھی شعر کو مستحسن قرار دیا ہے،[4]

---

۲ الوساطہ ص ۳۱-۳۲ ۳ ایضاً ص ۴۹ ۴ ایضاً ص ۶۲

سرقات کے مسئلہ پر جرجانی نے صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ مشترک معانی میں سرقہ کا سوال پیدا نہیں ہوتا اور جو لوگ مشترک معانی میں کسی شاعر کو سارق کہتے ہیں وہ نافہم ہیں[1]،

یہ بات ظاہر ہے کہ متنبی کی شاعری میں بہت سے عیوب ہیں، جن کی موافقت جرجانی نے کی ہے، مگر تنقید کے نقطۂ نظر سے ان کی تمام بحثوں سے عربی تنقید کو بہت فائدہ پہنچا اور عملی تنقید میں آمدی کے بعد ایک دوسری مثال قائم ہوگئی، ان کی ناقدانہ بحثیں فکر و نظر کا سرمایہ فراہم کرتی ہیں، اور اس لحاظ سے "الوساطۃ" عربی تنقید کی ایک اہم کتاب ہے۔

---

[1] الوساطۃ ص ۱۸۴

سلسلۂ شعر العجم

(مولفہ مولانا شبلی نعمانی)

حصہ اول: فارسی شاعری کی تاریخ جس میں شاعری کی ابتدا، عہد بعہد کی ترقیوں اور انکے خصوصیات و اسباب سے مفصل بحث کی گئی ہے، اور اسی کے ساتھ تمام شعرا (عباس مروزی سے نظامی تک) کے تذکرے اور انکے کلام پر تنقید و تبصرہ ہے، قیمت:- عہ

حصہ دوم: شعرائے متوسطین کا تذکرہ (خواجہ فریدالدین عطار سے حافظ و ابن یمین تک)۔ قیمت:- صہ

حصہ سوم: شعرائے متاخرین کا تذکرہ (فغانی سے ابوطالب کلیم تک) مع تنقید کلام۔ قیمت:- للعہ

حصہ چہارم: اس میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ ایران کی آب و ہوا، اور تمدن اور دیگر اسباب نے شاعری پر کیا اثر کیا، کیا تغیرات پیدا کیے اور شاعری کے تمام انواع و اقسام سے مثنوی پر بسیط تبصرہ۔ قیمت لعہ

حصہ پنجم:- اس میں قصیدہ، غزل اور فارسی زبان کی عشقیہ، صوفیانہ اور اخلاقی شاعری پر تنقید و تبصرہ ہے۔ قیمت:- صہ

منیجر

مطبوعات جدیدہ

علم جدید کا چیلنج۔ از وحیدالدین خاں صاحب، صفحات ۲۹۰، کتابت و طباعت بہتر، ناشر مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، ندوۃ العلماء لکھنؤ، قیمت صہ

"جس طرح ایٹم کے ٹوٹنے سے مادہ کے بارے میں انسان کے پچھلے تمام تصورات ختم ہوگئے، اسی طرح پچھلی صدی میں علم کی جو ترقی ہوئی ہے وہ بھی ایک قسم کا علمی دھماکہ (Knowledge explosion) ہے، جس کے بعد خدا اور مذہب کے متعلق تمام پرانے خیالات بجک سے اڑ گئے ہیں، یہ جو لین کہنے کے علم الفاظ میں علم جدید کا یہ چیلنج ہے، اور ان صفحات میں مجھے اسی چیلنج کا جواب دینا ہے"۔

اس کتاب کے مقدمہ کے یہ ابتدائی الفاظ ہیں جو یہاں نقل کیے گئے ہیں، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وحیدالدین خانصاحب نے اس چیلنج کے جواب کا ارادہ کرکے اپنے اوپر کتنی بڑی ذمہ داری لی ہے، علم جدید کی تشکیکات اور دوسرے مذاہب کی طرف سے اسلام کے بارے میں کئے گئے اعتراضات اور شبہات کے جواب میں ایک صدی کے اندر بہت کچھ متکلمانہ لٹریچر تیار کیا گیا ہے، اور اس سلسلے میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی، سید امیر علی سے لیکر اور اس دور کے متعدد مصنفین نے بڑا اچھا کام انجام دیا ہے، مگر ابھی تک یہ کوشش پورے طور پر نہیں کی گئی کہ علم جدید کے مشاہدات، تجربات اور مسلمات ہی کے ذریعہ خدا، آخرت، رسالت کو متکلمانہ مگر ناصحانہ انداز میں ثابت کرنے کی کوشش کیجائے، وحیدالدین خاں صاحب نے اس کتاب کے ذریعہ

اسی کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے، ممکن ہے کہ بعض اہل علم کے نزدیک اس مسئلہ کے کچھ پہلو تشنہ رہ گئے ہوں، مگر مجھے یقین ہے کہ اس موضوع پر اس سے بہتر کتاب کسی زبان میں ابتک نہیں لکھی گئی، اور وحید الدین خانصاحب نے اس چیلنج کے جواب میں جو اہم ذمہ داری لی تھی وہ اس سے پورے طور پر عہدہ برآ ہوئے ہیں،

اس کتاب کے مطالعہ سے بے خدا مفکرین اور سائنس دانوں کے بارے میں یہ کہنا پڑتا ہے الناس اعداء بما جہلوا، جو بات انسان کو نہیں معلوم ہوتی، اس کا وہ دشمن ہوتا ہے، علم جدید کو خواہ مخواہ مذہب کا مد مقابل قرار دیدیا گیا ہے، علوم جدیدہ تو قرآن کی اس پیشین گوئی کی سراپا تصدیق ہیں، سنریہم آیاتنا فی الآفاق وفی انفسہم - یہ کتاب اس قابل ہے کہ جلد از جلد اس کا انگریزی اور عربی میں ترجمہ کراکے شائع کرایا جائے اور یہ تحقیقات و نشریات اسلام کا سب سے بڑا کام ہوگا،

میر و سودا کا دور - از شناء الحق صاحب ایم اے، صفحات ۴۹۶، کتابت و طباعت متوسط، ناشر ادارۂ تحقیق و تصنیف ۱۴۱ وحید آباد کراچی ۱۸،

متقدمین کا دور دوم جن بزرگوں کی وجہ سے اردو زبان کا عہد زریں کہا جاتا ہے ان میں مرزا مظہر جانجاناں، خواجہ میر درد اور میر و سودا سر فہرست ہیں، اسی دور کو جسے مرزا مظہر اور خواجہ میر درد کا دور کہنے کے بجائے عام طور پر میر و سودا کا دور کہا جاتا ہے، اس عہد میں اردو زبان نے کتنی ترقی کی اور اس کے محسنین نے اس میں کیا کیا اصلاحات کیں اس کتاب میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے،

اس دور کے قریب قریب تمام ممتاز شعرا پر الگ الگ مستقل کتابیں لکھی جاچکی ہیں، مگر یکجا طور پر اس دور کے اہم شعراء کے کلام کی خصوصیات اور ان کی خدمات کو ابتک پیش نہیں کیا گیا ہے، اور نہ اس دور کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی پس منظر کی پوری تفصیل کی گئی ہے، جس کا اثر لازماً

اردو زبان پر پڑا ہے، ثناء الحق صاحب نے اس کتاب میں اس دور کے پورے پس منظر کی روشنی میں ۲۴ ممتاز شعراء کے کلام کی خصوصیات اور اردو زبان میں ان کی خدمات پر گفتگو کرنے کی کوشش کی ہے، ان کی بعض رایوں سے اختلاف کی گنجایش ہے، مگر انھوں نے ترقی پسندوں کی طرح کہیں انتہا پسندی اور جانبداری سے کام نہیں لیا ہے، بلکہ ہر جگہ اعتدال قائم رکھا ہے، البتہ اگر رواج عام کے خلاف انھوں نے اس کتاب کا نام "مرزا مظہر اور خواجہ میر درد کا دور" رکھا ہوتا تو اس دور کی خصوصیات کی اچھی عکاسی ہوتی، اردو شاعری میں تصوف کے خیالات کا اظہار اس دور کی عام خصوصیت ہے، مگر اس کو جس زور و شور اور مدلل طریقہ پر ان دونوں بزرگوں نے پیش کیا ہے، دوسروں نے نہیں کیا، اس لیے کہ یہ ان کا حال تھا اور دوسروں نے اس حال کی نقل کی ہے، پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تصوف کی آمیزش کی وجہ سے اردو شاعری کا قلب و قالب دونوں بدل گیا، اور وہ فارسی شاعری کے مد مقابل ہوگئی، اس لیے بطور علامت ان دونوں بزرگوں کا نام پیش کرنا چاہیے تھا، نہ کہ میر و سودا کا، بہرحال یہ اختلاف ذوق کی بات ہے، ورنہ کتاب کی افادیت اپنی جگہ پر مسلم ہے، اور اس کا مقدمہ بجائے خود ایک خاصہ کی چیز ہے،

تذکرۃ المفسرین - از قاضی محمد زاہد الحسنی، صفحات ۲۰۴، کتابت و طباعت بہتر، ناشر دار الارشاد کیمبل پور، مغربی پاکستان، قیمت للعہ

سارے علوم دینیہ کا مرجع قرآن ہے، اور تمام علوم اسی کے خادم ہیں، اس حیثیت سے حدیث و فقہ اور دوسرے دینی علوم قرآن کی تفسیر ہی ہیں، مگر قرآن کی تفسیر و تاویل کا یہ وسیع مفہوم ہے، اس کا اصطلاحی مفہوم قرآن کے الفاظ، معانی اور مصداق کی تعیین و توضیح کرنا ہے، پہلی حیثیت سے قرآن کی جتنی خدمت کی گئی ہے، دوسری حیثیت سے اتنی نہیں کی گئی، مگر پھر بھی ہر دور میں قرآن کی تفسیر و تاویل کا کام تسلسل کے ساتھ جاری رہا ہے، اور اسی کے ساتھ تفسیر کے

ہر ہر پہلو پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں، ان پہلوؤں میں ایک اہم پہلو طبقات المفسرین بھی ہے، اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ کس صدی میں کن لوگوں نے قرآن کی تفسیر کا کام کیا ہے، اردو میں اب تک اس موضوع پر کوئی جامع کتاب موجود نہیں تھی، قاضی زاہد الحسنی صاحب نے اس کمی کو اپنی اس کتاب سے پورا کر دیا ہے، اس میں ۳۵۰ مفسرین کے حالات اور ان کی تفسیروں کا تعارف شامل ہے، شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں تفسیر کے بارے میں کچھ اصولی باتیں بتائی گئی ہیں، کتاب اہل علم کے مطالعہ کے لائق ہے۔

دار العلوم دیوبند۔ از مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند، صفحات ۱۲۸، کتابت و طباعت اعلیٰ، ناشر دار العلوم دیوبند، قیمت: عہ

دار العلوم دیوبند کی قدامت اور اس کی خدمات کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے، مگر پھر بھی اس کے تفصیلی حالات کا علم کم لوگوں کو ہے، مولانا محمد طیب صاحب نے اس کتاب میں اس کی قدیم تاریخ بیان کرکے موجودہ دور میں اس نے جو ترقی کی ہے، اسکی تفصیل کر دی ہے، آخر میں اسکے قدیم و جدید اساتذہ، منتظمین اور دوسرے شعبوں کے ذمہ داروں کے نام وغیرہ کی تفصیل دیدی گئی ہے، شروع میں دار العلوم کی بنا اور مولانا نانوتوی کے اصول ہشتگانہ بھی درج کتاب کر دیے گئے ہیں، اس کتاب سے دار العلوم کا ایک ہلکا پھلکا اچھا تعارف ہو جاتا ہے، یہ ابنائے دار العلوم کے علاوہ دوسرے حضرات کے مطالعہ کے بھی لائق ہے،

جامعہ کی کہانی۔ از عبد الغفار صاحب مدھولوی، صفحات ۹۶، کتابت و طباعت عمدہ، ناشر مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔ قیمت سے

اس میں جامعہ کی ۲۰ سالہ تاریخ بیان کی گئی ہے، یعنی ۲۰ء سے لیکر ۱۹۴۷ء تک کے حالات بیان کیے گئے ہیں، عبد الغفار صاحب مدھولوی جو کچھ لکھتے ہیں اس میں ایجاز و اختصار سے کم ہی کام لیتے ہیں، اس لیے اس میں جامعہ کی ۲۰ سالہ زندگی کا ہر پہلو سامنے آگیا ہے، شیخ الہند کے پہلے خطبہ، ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی تقریر کا جو خلاصہ دیا گیا ہے، اس سے جامعہ کے بلند مقاصد پر پوری روشنی پڑتی ہے، جامعہ میں ۱۹۴۷ء کے بعد سے جو ذہنی و عملی تبدیلیاں ہوئی ہیں، افسوس ہے کہ اس کتاب میں اسکے اسباب پر کوئی گفتگو نہیں کی گئی ہے، ورنہ جامعہ کا ماضی و حال، دونوں ناظرین کے سامنے آجاتا اور اس سے اسکے کارناموں کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے میں مدد ملتی، بہر نوع کتاب دلچسپ اور مطالعہ کے لائق ہے۔

م - ح